

کا سارا سونا اس زنگ آلود آہن کے نیچے سے جھلک آیا تھا۔

اگلے روز جب ہم کاسنی حویلی سے رخصت ہوئے تو نگارا اور زریاب کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ میں اور سلطان بابا پھر سے کچھ نئے رشتے بنا کر اپنی اپنی راہ کے لیے نکل پڑے تھے۔ اسٹیشن پر بگن کا پورا ٹولا ہمیں رخصت کرنے کے لیے موجود تھا۔ میں جبل پور کے اسٹیشن پر اترنے سے پہلے سلطان بابا سے جلد وہاں کا پھیرا لگانے کا وعدہ لینا نہیں بھولا میں نے جبل پور اسٹیشن پر ہی زہرا کو ساری صورت حال ایک خط میں لکھ کر بھیج دی اور درگاہ کی جانب چل پڑا۔



**We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels, Imran series, Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers**

**If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com**

**or**

**send message at  
0336-5557121**

## لاریب

یونہی رات ہوئی اور پھر دن نکل آیا۔ میں نے ایک عجیب سی بات محسوس کی کہ اصغر صاحب کے چہرے پر ایک عجیب سی الجھن اور تناؤ کے آثار ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ خاص طور پر نماز کے اوقات میں وہ عجیب بے چین سے نظر آنے لگتے تھے۔ لیکن میں مذہب کو ہمیشہ سے ایک خاص حد کے اندر انسان کا بے حد ذاتی معاملہ سمجھتا ہوں۔ لہذا میں نے کبھی بھی ان کے معاملات میں دخل دینے کی کوشش کی نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی۔ یونہی چار دن گزر گئے اور جمعرات کا دن آپہنچا جب بشیر نے دیوں کا تیل بدلنے کے لیے آنا تھا۔ میں نے دور چوٹی سے نیچے گھائی میں بشیر کے کاٹکا آتے ہوئے دیکھا لیکن آج تا نگے کی بچھلی نشست خلاف معمول ایک جالی دار پردے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پھر کچھ زمانہ سواریاں بھی تا نگے سے اتریں۔ کچھ دیر میں سب سے پہلے بشیر اور گاہ کے صحن میں وارد ہوا اور جلدی جلدی تیل کی کچی سے تازہ تیل ہر دیے کی کنوری میں اٹھینے لگا۔ ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی چلتی رہی۔ ”خان صاحب کی حویلی کی زنانیاں آئی ہیں دعا کرنے، کرم دین بھی ساتھ ہے۔ لاریب بی بی آتی ہیں ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو یہاں۔۔۔۔۔ اپنے خان صاحب کی چھوٹی بیٹی ہیں۔ بڑی والی امینہ تو دو سال پہلے ہی بیاہ کر رحمان گڑھ کے چوہدری اجمل کے ہاں چلی گئی تھی۔۔۔۔۔“ پھر جیسے بشیر کو کچھ یاد آیا اور وہ میرے قریب آ کر راز دارانہ انداز میں بولا۔ امینہ اور چھوٹی بی بی کی سنگی ماں کا بہت سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اب جو وہ بیگم صاحب لاریب بی بی کے ساتھ اوپر آ رہی ہیں وہ اُن کی سوتیلی ماں ہے۔۔۔۔۔ خان صاحب نے بیٹیوں کے لیے دوسری شادی رچا لی تھی۔۔۔۔۔“

اسنے میں وہ دونوں درگاہ کے صحن تک آپہنچیں اور بشیر نے کے رواں تہرے کو جیسے بریک سی لگ گئی۔ آنے والیوں میں سے ایک بردار اور سنجیدہ طبع تھی اور دوسری جو عمر میں چھوٹی تھی کافی شوخ و شنگ سی دکھائی دے رہی تھی۔ اگر بشیر نے کی زبانی مجھے اس ماں بیٹی کے رشتے کا پتا نہ چلتا تو میں انہیں کبھی ماں بیٹی نہ سمجھتا، کیونکہ دونوں کی عمر میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ شاید خان صاحب کی دوسری بیگم کی نو عمری میں ہی شادی ہو گئی تھی کیوں کہ وہ لاریب کی بڑی بہن ہی لگ رہی تھی۔ دونوں نے احاطے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے فاتحہ پڑھی اور قبر پر پھول چڑھائے۔ میں جب کبھی ان قبروں پر لوگوں کو ازراہ عقیدت پھول چڑھاتے، یا اگر بتیاں جلاتے اور خوشبو بکھیرتے ہوئے دیکھتا تھا تو جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی بے چینی اور الجھن کا احساس ہوتا تھا جیسے ہم بیک وقت ان پھولوں کی نازک پتھریوں اور اس قبر کی بے حرمتی کر رہے ہوں۔ اصغر صاحب نہ جانے صبح سویرے ہی کہاں نکل گئے تھے۔ میں احاطے کی کچی دیوار کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی انگوڑ کی بیلوں کی جانب بڑھ گیا جس کے پتے سردی کی وجہ سے زرد آتشیں رنگ کے ہو کر زمین پر یوں بکھرے رہتے تھے جیسے کوئی مصور سبز، دھانی اور زرد رنگوں کے چھینٹے کیٹوئس پر گراتا چلا گیا ہو۔ انہی بیلوں کے نیچے شفاف پانی کی وہ کشادہ نالی بھی بہتی تھی جس کا منبع درگاہ سے باہر کسی اونچی چوٹی سے نکلتا ہوا ٹھنڈے ٹپٹھے پانی کا وہ چشمہ تھا جس کا دھارا اسی درگاہ کے صحن سے اس



نالے کی صورت ہو کر گزرتا تھا۔ اس بہتے جھرنے اور اس نالے کی رم جھم جھمی ٹھنڈی میٹھی آواز نے درگاہ کے اس سکوت کو اور بھی مقدس بنا رکھا تھا۔ دو تین دن سے رات کو چونکہ سردی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا تھا لہذا اس بہتے پانی پر شفاف سی برف کی شیشے نما تہہ سی بن جاتی تھی، جودن نکلنے اور دھوپ چڑھنے پر دھیرے دھیرے پگھل کر پھر سے اسی رواں پانی کا حصہ بن جاتی تھی۔ اس وقت بھی شیشے جیسی برف کی وہ پتلی سی تہہ درمیان سے ٹوٹ کر پانی بن چکی تھی اور کناروں پر پتلی اس کی باقیات قطرہ قطرہ پگھل رہی تھیں۔ میں نہ جانے کتنی دیر سے برف اور پانی کا یہ کھیل دیکھ رہا تھا کہ اچانک میرے قریب بشیرے کے کھکانے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ اور اس کی بڑی مالکن نہ جانے کب سے وہاں کھڑے تھے۔ شاید مالکن نے مجھ سے کوئی سوال بھی کیا تھا لیکن میں اپنی محویت کی وجہ سے اسے سن نہیں پایا۔ میں نے جلدی سے معذرت پیش کی۔ وہ دھیرے سے مسکرائیں۔

”تو تم ہو اس درگاہ کے نئے مجاور..... لیکن تم تو ابھی کم عمر ہو..... کیا جلدی پستی مجاور ہو.....؟ نام کیا ہے تمہارا.....؟“

”عبداللہ.....“ میں نے ان کے سوال کے پہلے حصے کا جواب دینے سے گریز کیا۔ انہوں نے بھی دوبارہ اصرار نہیں کیا اور بولیں۔ ”اچھا عبداللہ..... تمہیں کچھ خدمت سرانجام دینا ہوگی۔ ہمارا ہر جمعرات کو یہاں آنا ممکن نہیں، لہذا اچھلے خدمت گار کی طرح اب تمہی کو ہر جمعرات یہاں نیاز بانٹنے کا انتظام کرنا ہوگا۔ بشیر تمہیں ساری تفصیل بتا دے گا۔ کوئی مشکل ہو تو پوچھ لینا۔“

”جی بہتر.....“ وہ پلٹ کر جانے لگیں پھر انہیں جیسے کچھ یاد آیا۔ اتنے میں دور کھڑی کبوتروں کو دانہ ڈالتی لاریب بھی ہاتھ جھاڑ کر ہماری جانب بڑھ آئی۔ بڑی مالکن نے مجھ سے پوچھا۔

”تمہارے گھر والے کہاں ہیں..... شادی ہوئی ہے تمہاری.....؟“

”نہیں..... میں یہاں اکیلا ہوں..... ماں باپ دور کسی شہر میں رہتے ہیں۔ میں اکلوتا ہوں۔“ اب لاریب کی باری تھی۔ میرا جواب سن کر وہ چونکی اور کچھ تیز لہجے میں بولی۔

”ارے..... تو انہیں بھی ساتھ لے کر آنا چاہتے تھانا..... وہ بے چارے اکیلے وہاں کیسے گزرا کرتے ہوں گے..... ان کے لیے کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بتا دینا۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں ان کو بھی یہیں بلوا لو..... پچھلے مجاور کا تو پورا خاندان اسی درگاہ میں رہتا تھا۔“

مجھے لاریب کی بات سن کر ماما کا جملہ یاد آ گیا کہ جہاں کہیں بسیرا کروا میں بھی وہیں بلوا لینا اور جانے کیوں یہ سوچتے ہی میرے ہونٹوں پر خود بخود ہلکی سی مسکراہٹ آگئی کہ ماما اور پاپا بھی میرے ساتھ ہی اس درگاہ کے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے ہوں گے اور پتا نہیں کیسے میرے منہ سے نکل پڑا۔

”پہلے میں خود تو اس دنیا کے طور طریقے اور رہن سہن سیکھ لوں..... پھر انہیں بھی یہیں بلوا لوں گا.....“

لاریب اور بڑی مالکن نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ لیکن تیرکمان سے نکل چکا تھا۔ جب سے میں نے درگاہ کی زندگی اختیار کی تھی میری حتی الامکان کوشش یہی ہوتی تھی کہ میں اپنے الفاظ، برتاؤ، یا کسی بھی اور طور طریقے سے دوسروں پر کوئی ایسی بات ظاہر نہ ہونے دوں جس سے انہیں میرے ماضی، یا میرے رشتوں کے بارے میں کوئی بھی اندازہ ہو سکے۔ دراصل میں جس راستے کا مسافر تھا اس کی منزل نمایاں ہونے سے نہیں بلکہ غیر نمایاں ہو کر ہی نظر آ سکتی تھی۔ اسی لیے میں ہمیشہ بھیڑ اور ہجوم میں کھوئے رہنے کو ترجیح دیتا تھا لیکن آج بے حد احتیاط کے باوجود شاید مجھ سے

الفاظ کے چناؤ میں کوتاہی ہوئی تھی اور نتیجہ میں اپنے سامنے کھڑی لاریب کی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی حیرت سے اخذ کر سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتی رہی۔ سورج کی ایک کرن اس کی نازک سی ناک میں پڑے کوکے سے منعکس ہو کر اس کے گلابی چہرے پر نور کا ایک سنہری ہالہ سا بنا رہی تھی۔ کچھ لوگوں کا حسن پہلی نگاہ میں ہماری نظر کو خیرہ نہیں کرتا، بلکہ دھیرے دھیرے کچھ الگ زاویوں سے ہم پر کھلتا ہے۔ لاریب کا چہرہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پرت در پرت کھلنے والا۔ اس کی بڑی بڑی سی آنکھوں میں ہر وقت شرارت سی بھری رہتی تھی اور اسے ہمہ وقت اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبانے کی عادت تھی جب کہ اس کے چہرے پر بائیں گال پر ایک ہلکا سا گلابی گڑھا پڑ جاتا تھا۔ خاص طور پر جب وہ مسکراتی تھی تب..... اور اس وقت یہ تمام کیفیات پوری طرح اس کے چہرے پر واضح تھیں جب اس نے میری بات کے جواب میں شرارتا کہا۔

”انہیں بھی یہیں بلواؤ..... ویسے بھی کافی کمرے خالی پڑے ہیں..... کچھ رونق ہی رہے گی۔“

بڑی مالکن نے کڑی نظروں سے لاریب کو گھورا۔ جو ابادہ مند میں اپنی کالی چادر کا پلو دبا کر زور سے ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کی آواز بالکل اس جھرنے سے مشابہ تھی جو درگاہ سے اوپر والی چوٹی سے نکل کر بہہ رہا تھا۔ بڑی مالکن نے جانے سے پہلے مجھے دعا دی۔ ”کسی اچھے گھر کے لگتے ہو..... جیتے رہو.....“ وہ دونوں پلٹ کر چل دیں۔ بشرے نے جاتے جاتے مجھے یاد دلانا ضروری سمجھا کہ مجھے اسکی منت کے پورا ہونے کی دعا کرتے رہنا ہے۔ کرم دین مانیتا کا نپٹا اپنی لکڑی کی بڑی سی ڈانگ سنبھالے حویلی کی بیبیوں کے آگے جیتے دوڑا چلا جا رہا تھا۔ نیچے اتر کر وہ تانگے پر بیٹھیں اور تانگا آگے چل پڑا۔ اسی اثنا میں اصغر صاحب بھی پسینے میں شرابور درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئے۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت دور سے پیدل چل کر آ رہے ہوں۔ میں نے جلدی سے انگور کی بیلوں کے نیچے رکھے گھڑوں میں سے ایک گلاس پانی بھر کر انہیں پیش کیا جسے وہ ایک ہی سانس میں انڈیل گئے۔ ”خوش رہو میاں..... میں دراصل کسی کام سے نیچے گاؤں کے بازار تک گیا تھا، کچھ لوگ اور لوہان وغیرہ چاہئے تھا۔ واپسی پر چھوٹے رستے کی لالچ میں زیادہ چڑھائی چڑھ گیا۔ کم بخت اب عمر بھی تو نہیں رہی نا.....“ اصغر صاحب حسب معمول بات کرتے وقت اپنے گئے میں پڑے اس سرخ دھاگہ نما تعویذ سے کھیلتے رہے جو میں پہلے دن سے ان کے گلے میں مضبوطی سے کسا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی تو اس دھاگے کی سختی اور ان کے گلے میں پڑے سرخ نشانات دیکھ کر مجھے الجھن سی ہونے لگی تھی کہ آخر اتنا کس کر دھاگا گلے میں باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟ کہ خواہ مخواہ ہی انسان خود کو اذیت میں ڈالے رکھے، لیکن میں ایک بار پھر ان سے کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ شاید یہ دھاگا بھی ان کی اسی منت کا ہی کوئی تسلسل تھا۔ مجھے گہری سوچ میں پڑا دیکھ کر وہ ہلکے سے مسکرائے۔ ”میں جانتا ہوں تمہارے ذہن میں ہمہ وقت میرے متعلق بہت سارے سوالات پھلتے رہتے ہیں لیکن تمہاری یہی عادت مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے کہ تم کبھی چاہ کر بھی اپنے دائرے سے باہر نہیں نکلتے اور ہمیشہ غیر ضروری سوالات سے اجتناب کرتے ہو اور یہی تمہارے گہرے اور اعلیٰ ظرف کی نشانی ہے۔“

میں نے غور سے ان کی جانب دیکھا۔ ”چنانچہ کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کسی شدید درد کا شکار ہیں۔ جب کبھی آپ کو ایسا لگے کہ میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں تو مجھے ضرور کہئے گا۔“ اصغر صاحب نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے میرا کاندھا تھپتھا کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

جبل پور ایک چھوٹا سا قصبہ نما گاؤں تھا جو چاروں جانب سے اونچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ جن کی چوٹیوں کو شام ڈھلے عموماً بادلوں کی



دھند ڈھک لیتی تھی اور پھر رات گئے، یا صبح سویرے کچھ دیر کے لیے ہلکی بارش ضرور ہوتی تھی۔ گاؤں کا واحد بازار قصبے کے وسط میں واقع تھا، جہاں ٹین کی چھتوں اور لکڑی کے بڑے بڑے پرانے دروازوں والی چند دکانیں بنواریں سے پہلے سے ایستادہ تھیں جن میں گندم، جو، گڑ، تیل اور دیگر راشن لیے بیٹھے دکان دار حیرت زدہ ہی نگاہوں سے کسی اجنبی کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھتے رہتے تھے۔ بازار کا لین دین زیادہ تر موسمی فصل کی بوائی اور کٹائی پر منحصر ہوتا تھا اور انہی دنوں میں لوگ اپنے پرانے ادھار اتارنے اور ایک نیا قرض سر پر اناج کی بور یوں سمیت اٹھائے چلے آتے۔ پھر بھی یہ سب لوگ خوش باش رہتے تھے اور ان کی ہنسی میں ہنسی اور آنسوؤں میں آنسوؤں کا ذائقہ ابھی خالص تھا۔ سچ ہے کہ زندگی الگ چیز ہے۔ زندہ رہنا الگ بات ہے۔ میں نے جیل پور کے لوگوں کو زندہ محسوس کیا تھا۔ ان کی نیند پر سکون تھی اور صبح ان کے لیے دھوپ کی صورت میں سورج کا خنجر لیے وار نہیں ہوتی تھی۔ قصبے کا واحد مال دار اور متحمل گھرانہ کریم خان کا تھا جن کی حویلی پورے گاؤں کی واحد اور باعث فخر و شرف تھی۔ خود کریم خان کا دل بھی ان کے نام کی طرح بڑا تھا اور گاؤں کے نہ جانے کتنے گھرانے در پردہ ان کی اعانت سے ہی چل رہے تھے۔ بیوی کی موت کے بعد ان کی زندگی کا محور ان کی دو بیٹیاں ہی رہ گئیں تھیں۔ وہ بچیوں کو دل کا چھالنا کر رکھتے تھے اور ان پر سوتیلی ماں لانے کے بے حد خلاف تھے لیکن سال بھر میں ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ لڑکیوں کی تربیت میں ایک خاص عنصر ان کی ماں کا بھی ہوتا ہے جو ایک عورت کی موجودگی سے ہی پورا ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسی عورت کہاں سے ملتی جو ان کی بیٹیوں کو ماں نہیں، ایک سہیلی بن کر پالتی۔ آخر کار بزرگوں کی نظر کریم خان کی مرحومہ بیوی کی چھوٹی، بہن صائمہ پر پڑی جس نے ابھی تازہ تازہ بارہویں جماعت کا امتحان دیا تھا اور وہ درحقیقت کریم خان کی دونوں بیٹیوں کی پسندیدہ خالہ بھی تھی۔ تب کریم خان کی بڑی بیٹی امینہ ساتویں جماعت میں تھی اور سیکنڈ نے ابھی چوتھی جماعت میں قدم رکھا تھا۔ یوں صائمہ اگلے مہینے ہی دو کپڑوں میں بیاہ کر کریم خان کی حویلی میں چھوٹی مالکن سے بڑی مالکن کی گدی سنبھال چکی تھی۔ ایسے وقت میں کریم خان کے سسرال والوں کے ایثار اور سمجھ داری نے بھی بڑا کردار ادا کیا ورنہ صائمہ کی ماں کا دل تو اپنی پھولوں جیسی بیٹی کو یوں رخصت کرتے وقت کٹا جا رہا تھا۔ لیکن دوسری جانب بھی تو ان کے اپنے جگر ہی کے دو ٹکڑے تھے جن کے لیے انہیں یہ قربانی دینا ہی تھی۔ صائمہ بیاہ کر کریم خان کے گھر آ گئی اور پھر اس نے ماں کے نام کے ساتھ لگا یہ 'سوتیلی' کے لائق کو کچھ اس طرح سے منایا کہ لوگ سوتیلی لفظ کو بھی بھول گئے صائمہ نے دونوں بیٹیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی اور بڑی کو تب تک رخصت نہیں کیا جب تک وہ قریبی کالج سے بی اے کی فرسٹ ڈیویژن کی ڈگری لے کر گھر واپس نہیں آ گئی۔ اسی طرح وہ آج کل اسی تنہا دہی سے لاریب کو اس کی گریجویشن کی تیاری کروا رہی تھی۔ کریم خان کو لگتا تھا کہ خدا نے اس کے سبھی اچھے اعمال کا بدلہ اسی دنیا میں صائمہ کی صورت میں اسے دے دیا تھا۔ دونوں بیٹیوں نے بھی ماں کو ماں سے زیادہ اپنی سہیلی اور سہیلی سے بڑھ کر ماں سمجھا اور اسے وہی مان دیا جو وہ اپنی سگی ماں کو دے سکتی تھیں۔ لاریب تو ویسے بھی صائمہ سے بہت قریب تھی اور دونوں ہی ایک جان دو قالب کی تشریح بنی اس اونچی حویلی میں اپنے جیون بیتا رہی تھیں۔ لاریب کو کتابوں سے بے حد شغف تھا اور کریم خان نے بیٹی کی سہولت کے لیے حویلی میں ہی ایک چھوٹی سی لائبریری بنا رکھی تھی جہاں ہر ہفتہ پندرہ دن کے وقفے کے بعد شہر سے چند نئی کتابیں ضرور شامل ذخیرہ کتب ہو جاتی تھیں۔ لاریب کو اپنے بی اے کے رزلٹ کا انتظار تھا جس کے بعد وہ شہر کی بڑی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر آ گئے پڑھنا چاہتی تھی لیکن فی الحال کریم خان اس کے حق میں نہیں تھے مگر لاریب کو یقین تھا کہ اپنی ہر ضد کی طرح وہ اس بات کو بھی اپنی لاڈلی ماں کے توسط سے منوالے گی۔ ویسے بھی وہ تھی ہی اتنی شوخ و شنگ کہ اس کے ناز کے سامنے اس کے باپ کا غصہ کچھ کم ہی ٹھہر پاتا تھا۔ سارا دن

حویلی میں اس کی ہنسی اور قہقہوں کا جل ترنگ بچتا رہتا تھا اور وہ پورا دن کسی کو بھی تک کر نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ صبح سویرے دھوپ نکلتے ہی رضائیاں اور انگلیاں دھوپ میں ڈالی جا رہی ہیں تو گیارہ بجے گرم پکڑے اور سمو سے تلے جا رہے ہیں۔ ابھی اندر کا ہنگامہ ختم ہوا نہیں کہ سہ پہر سے پہلے آسمان پر بادلوں کی گھنڈا دیکھتے ہی حویلی سے لمحہ باغ میں جھولے ڈلوائے جا رہے ہیں۔ ابھی پہلی بوند گرتی نہیں کہ بارش کے پکوان باغ کے جھولوں تلے بننا شروع۔ ابھی نوکر باغ میں تیل کی کڑائیاں پچھا کر اپنی کرسی سیدھی بھی نہیں کر پائے ہوتے کہ شام کی چائے کا غلغلہ شروع، ساتھ ہی ساتھ دوپٹوں کی رنگائی اور سادوں کے لیے مئے کپڑوں کی بنائی، درزی تو سال بھر جیسے حویلی کے دروازے سے ہی رنگار بھتا تھا اور پھر مغرب ڈھلی نہیں کہ حویلی کے سب سے بڑے کمرے میں انگلیٹھیاں جلوانے کی دوڑ دھوپ شروع، خشک میوے کی پراتیں خافٹ وہاں پہنچا دی جاتیں اور پھر رات کے کھانے کے فوراً بعد گرم قہوہ، سبز، یا کشمیری چائے بڑے بڑے فجانوں میں وہاں کمرے میں پہنچا دی جاتی اور پھر جب کریم خان باہر کے بکھیروں سے فارغ ہو کر اپنی چیتیتی بیٹی کے پاس آتے تو پھر رات گئے تک ماں باپ دونوں ہی بیٹی کی باتوں کی سرگم سے محظوظ ہوتے رہتے، وہ تھی بھی کچھ ایسی ہی، چند لمحوں میں ہی سب کو اپنا بنا لینے والی۔ حویلی کے بھی نوکر بھاگ بھاگ کر اس کے کام یوں کرتے تھے جیسے ان سے ذرا سی بھی تاخیر ہو گئی تو ان کی لاڈلی مالکین کہیں ان کے حصے کا کام کسی اور کے حوالے کر دے گی اور وہ تو دن بھر اس آس میں اپنے کان اپنی چھوٹی مالکین کی پکار پر لگائے رکھتے تھے کہ کب اس کے بیٹھے لیوں سے ان میں سے کسی کا نام نکلے اور وہ دوڑتا، یاد دلاتی ہوئی اپنی ہر دل عزیز مالکین کے پاس پہنچ جائیں۔ سچی تو کریم خان کا دل نہیں مانتا تھا کہ اپنی اس بولتی مینا کو ایک بار پھر سے یونیورسٹی ہوٹل کی بھول بھلیوں میں بھجوا دے۔ ابھی دو ماہ پہلے ہی تو وہ شہر کے کالج سے امتحان دے کر لوٹی تھی۔ اب وہ کسی طور بھی اپنی لاڈلی کو خود سے جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بائل جانے پیار پالتے ہوئے ہمیشہ یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ بیٹیاں تو سدا سے پر ایا دھن ہوتی ہیں۔ صائمہ بھی ہمیشہ شوہر کو یہی سمجھاتی رہتی تھی کہ بیٹی سے اتنا زیادہ پیار اور لگاؤ بعد میں بہت تڑپاتا ہے۔ لیکن ان جذبوں پر انسان کا قابو ہوتا تو پھر زندگی میں رونا ہی کس بات کا تھا اور پھر کچھ لوگوں میں کچھ ایسی ہی بات بھی تو ہوتی ہے، دل میں کھب جانے والی..... وہ بھی ایسی ہی تھی..... چند لمحوں میں ہی آنکھوں کے راستے دل میں اتر کر خون سے تحلیل ہو جانے والی..... اور اس کی یہ شوخ طبیعت اور قہقہے اب واقعی حویلی کے در و دیوار میں تحلیل ہی تو ہو چکے تھے۔

یہ ساری باتیں مجھے آتے جاتے بشرے اور کسی حد تک کرم دین سے پتا چلتی رہیں۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ ماما کی تاکید کے مطابق میں انہیں ہر ہفتے تاکید سے خط لکھ دیتا تھا اور ہر چند ہواڑے میسر آنے پر فون بھی کر لیتا تھا۔ اس دن بھی جب میں گاؤں کے واحد تار گھر سے ماما سے فون پر بات کر کے واپس درگاہ آیا تو بے حد اس تھا ماما کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ انہوں نے خود تو نہیں بتایا لیکن پایا ہے جب بات ہوئی تو انہوں نے وہ لفظوں میں ان کی طبیعت کا ذکر کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سلطان بابا کا کہیں اتا پتا ملے تو میں ان سے ایک ہفتے کی چھٹی لیکر گھر ہواؤں۔ لیکن شام ڈھلنے سے پہلے ہی اصغر صاحب کو شدید بخار آنے لگا۔ سردی کی شدت کافی بڑھ چکی تھی اور وہ نہ جانے دن بھر کہاں بھٹکتے رہتے تھے۔ شاید اسی آوارہ گردی کے دوران انہیں سردی لگ گئی تھی۔ رات ہوتے ہوتے وہ بالکل ہی بے سدھ ہو گئے اور مجبوراً مجھے انہیں کمرے میں اٹھا کر لانا پڑا۔ ان کی بے ہوشی کے وقفے گہرے ہوتے جا رہے تھے اور درمیان میں تھوڑا بہت ہوش آتا بھی تو بے سدھ سے پڑے رہتے۔ وہ ہڈیاں میں کچھ عجیب سی باتوں کی گردان بھی کر رہے تھے۔ ”توڑ دوں گا..... میں اس دھاکے کو توڑ دوں گا۔ مجھے آزاد کر دو.....“ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں



انہیں کیسے سنبھالوں کیونکہ مجھے ایسی کسی تیار داری کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں تھا اور میرے پاس یہاں درگاہ میں ایسی کوئی خاص دوا بھی نہیں تھی جو اس بیماری میں میں انہیں بلا سکتا۔ مجھے یہ بھی تشویش تھی کہ انہوں نے آج تک کبھی اپنے کسی اتے پتے سے بھی مجھے آگاہ نہیں کیا تھا، نہ ہی مجھے ان کے کسی اور رشتے دار وغیرہ کا پتا تھا۔ آدھی رات تک مجھ سے جو بھی بن پڑا وہ میں نے کیا لیکن ان کی حالت سدھرنے کی بجائے مزید بگڑتی ہی گئی اور آخر کار مجھے فیصلہ کرنا ہی پڑا کہ مجھے نیچے گاؤں جا کر کسی مدد کا انتظام کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن یوں آدھی رات کو میں کس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔ مجھے تو وہاں نیچے کسی حکیم، یا طبیب کا بھی پتا نہیں تھا۔ لہذا اس نیم شب میں جب سردی رگوں کو اندر سے کاٹ رہی تھی اور گاؤں بھر میں کسی بھی ذی روح کا نشان تک ڈھونڈنے سے نہ ملتا تھا، میں نے بڑی حوصلی کے پھانک پر دستک دی اور پھر جانے کتنی دیر بعد کسی دربان کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھولنے والا کرم دین نہیں تھا، کوئی دوسرا پکی عمر کا مرد تھا جو یوں آدھی رات کو اپنی نیند خراب کئے جانے پر کافی حد تک برہم بھی نظر آ رہا تھا۔ اس نے پھانک کھلتے ہی درشت لہجے میں پوچھا۔

”کیا بات ہے.....؟“

میں نے اس کے لہجے کو نظر انداز کر دیا۔

”میرا نام عبداللہ ہے..... میں پہاڑی والی درگاہ کا مجاور ہوں..... میں.....“ اس نے میری بات پوری ہونے سے قبل ہی کاٹ دی۔

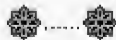
”صبح آنا..... اس وقت سب سو رہے ہیں.....“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ بند کرنے کی ٹھانی اور زیر لب کہا۔ ”نہ دن دیکھتے ہیں نہ رات..... یہ کبھی کوئی وقت ہے مانگنے کا.....“ وہ مجھے کوئی بھکاری سمجھ رہا تھا۔ ویسے ٹھیک بھی تھا، ہر طلب گار بھکاری ہی تو ہوتا ہے۔ میں نے جلدی سے اسے روکا۔

”مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہئے..... دراصل اوپر درگاہ میں ایک مریض کی حالت بہت بری ہے..... مجھے اس کے لیے کچھ دوائیں چاہئیں..... آپ اگر خان صاحب سے جا کر.....“

اس نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی۔ ”نہیں نہیں..... خان صاحب اس وقت کسی سے نہیں ملتے..... اور اب اس آدھی رات کو میں کہاں سے دوا دارو کا انتظام کروں.....؟..... تم اگر واپس نہیں جاسکتے تو یہیں حویلی کی ڈیوڑھی میں ایک طرف پڑے رہو، خان صاحب صبح کی نماز کے لیے انھیں گے تو تمہاری بات کروادوں گا..... اب جاؤ اور مجھے بھی سونے دو.....“

اس نے ایک بار پھر مجھے دھتکار کر پھانک بند کرنے کی ٹھانی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح ہے صورت حال کی نزاکت سمجھاؤں۔ میں نے بھی مجبوراً واپس کی ٹھانی۔ اتنے میں اندروالی ڈیوڑھی کے اندھیرے سے کسی عورت آواز ابھری۔

”دروازے پر کون ہے جملے.....“



## دوسرا مسیحا

حویلی کا دربان چونک کر پلٹا۔ ڈیوڑھی کے اندھیرے سے بڑی مالکن اور لاریب آگے بڑھ کر دیوار کے ساتھ لگی جلتی مشعل کی روشنی میں آگئیں۔ وہ دونوں جانے کب دروازے پر بات چیت اور بحث کی آوازیں سن کر ڈیوڑھی میں چلی آئیں تھیں۔ دربان گھبرا سا گیا۔

”پتا نہیں کون بھکاری ہے جی..... آدھی رات کو خان صاحب کو جگانے کا کہہ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ ہم اس وقت ان کی نیند خراب نہیں کر سکتے..... جو بھی چاہئے صبح آکر لے جائے، بڑی مالکن.....“ انہوں نے جمالے کی بات پر دھیان نہیں دیا اور آواز دے کر بولیں۔

”کون ہے دروازے پر..... سامنے آؤ.....“

میں نے پچانک سے اندر قدم رکھ کر انہیں سلام کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکیں۔ لاریب بھی حیران سی تھی۔ ”عبداللہ..... تم..... خیریت تو ہے.....“

میں نے انہیں اصغر صاحب کی بیماری سے لے کر حویلی کا در کھٹکانے تک کا تمام ماجرا سنا دیا۔ انہوں نے فوراً لاریب کو اندر سے میڈیکل بکس لانے کا کہا اور جمالے کو ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلائی کہ اسے کتنی بازنع کیا ہے کہ کسی بھی سائل کو یوں دروازے سے واپس نہ لوٹایا کرے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ وہ کرم دین کی گھر والی، جو حویلی کے احاطے میں ہی اپنی کوٹھڑی میں بیمار پڑی تھی، کی دوا بنا کر اسے دینے کے لیے جا رہی تھیں کیونکہ طبیب نے اسے ہر چھ گھنٹے کے بعد ایک تازہ دوا کی خوراک دینے کی تاکید کی تھی اور لاریب کی ضد تھی کہ وہ خود ہی انہیں دوا کھلائے گی کیونکہ کرم دین کو شک تھا کہ اس کی گھر والی ان کڑوی کسلی دواؤں سے تنگ آ کر اب انہیں آنکھ پچا کر بہاوتی ہے۔ لہذا اب دوا کی تمام خوراکیں لاریب کی نگرانی میں پلائی جاتی تھیں اور پھر جب لاریب جاگ رہی ہو تو بھلا وہ اپنی کسلی اپنی پیاری ماں کو کہاں سونے دے سکتی تھی اور یہی جگ راتا انہیں رات کے اس پہر دروازے تک لے آیا۔ ورنہ شاید مجھے پوری رات وہیں حویلی کی ڈیوڑھی میں انتظار کرنا پڑتا۔ لاریب کچھ ہی دیر میں میڈیکل بکس لے آئی جس میں بخار کی انگریزی دوا کیں بھری پڑی تھیں۔ بڑی مالکن نے وہ بکس میرے حوالے کیا اور مجھے دوا پلانے کے بارے میں کچھ ہدایات جاری کر کے واپس درگاہ جانے کا کہا جب کہ جمالے کو حکم دیا گیا کہ وہ فوراً جا کر حکیم صاحب کو جگائے اور انہیں لے کر اوپر درگاہ مریض کے پاس پہنچے۔ ویسے تو گاؤں میں ایک سرکاری ڈسپنسری بھی تھی لیکن اس کا پچھلا سرکاری ڈاکٹر سفارش کروا کر کسی بڑے ضلع میں اپنا تابلہ کروا چکا تھا اور پچھلے ڈیڑھ سال سے کسی نئے ڈاکٹر کی تعیناتی کھٹائی میں پڑی ہوئی تھی کیوں کہ جس کو بھی اس دور دراز علاقے میں تعینات کیا جاتا وہ آنے سے پہلے دوڑ دھوپ کر کے اپنا تابلہ رکھ لیتا تھا۔

میں دواؤں کا بکس لے کر پلٹنے لگا تو بڑی مالکن نے مجھے آواز دی۔۔۔

”سنو عبداللہ.....“ میں ٹھٹھک کر پلٹا تو وہ غور سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔



جمالے کی باتوں کا برانہ ماننا..... تم کوئی مانگنے والے نہیں..... اس گاؤں بھر کے مہمان ہو..... لیکن تمہارے ساتھ آج جو برتاؤ اس حویلی کے دروازے پر ہوا ہے اس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں..... خان صاحب کو پتا چلے گا تو وہ اس جمالے کی خوب خبر لیں گے.....“

میں نے جلدی سے ان کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ”نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے..... میرا حلیہ ہی شاید ایسا ہے کہ جمالے کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو دھوکا کھا جاتا آپ خان صاحب کو اس ساری تفصیل سے آگاہ نہ کیجئے گا۔ یہ میری آپ سے گزارش ہے۔ معاف کرنے میں بڑائی ہے..... آپ بھی جمالے کو معاف کر دیجئے.....“

ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”جیتے رہو.....“ لاریب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن تب تک میں وہاں سے پلٹ چکا تھا۔ میں اوپر درگاہ میں پہنچا تو اصغر صاحب بالکل ہی بے سدھ پڑے تھے۔ بڑی مشکل سے ان کے حلق میں دو انڈلی۔ کچھ ہی دیر میں جمالہ بھی حکیم صاحب کو لے کر پہنچ گیا اور حکیم نے بڑی جانفشانی سے دن چڑھے تک اصغر صاحب کی کچھ ایسی دیکھ بھال کی کہ دو پہر تک وہ بمشکل آنکھیں کھولنے کے قابل ہو سکے۔ حکیم صاحب ابھی وہیں موجود تھے جب خان صاحب بھی تیمارداری کے لیے درگاہ آ پہنچے اور کافی دیر وہیں اصغر صاحب کے سر ہانے بیٹھے رہے۔ انہوں نے بہت چاہا کہ اصغر صاحب کچھ دن کے لیے نیچے ان کی حویلی کے مہمان خانے میں منتقل ہو جائیں لیکن وہ نہیں مانے۔ پتا نہیں کیوں اصغر صاحب ایک رات بھی درگاہ سے باہر نہیں گزرتا چاہتے تھے۔ شاید یہ بھی ان کی مانی ہوئی منت کی کوئی مجبوری تھی؟ خان صاحب نے جاتے وقت حکیم کو تاکید کہ وہ اصغر صاحب کے ٹھیک ہونے تک دن میں ایک مرتبہ درگاہ کا پچھرا ضرور ڈال جایا کریں کیوں کہ خان صاحب اصغر صاحب کو بھی اپنا مہمان سمجھتے تھے اور مہمان کی تیمارداری اور علاج میں وہ کوئی غفلت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ طبیب کے جانے کے بعد اصغر صاحب بہت دیر منونیت بھرے لہجے میں میرا شکریہ ادا کرتے رہے کہ میں نے ان کے لیے بڑی زحمت برداشت کی۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں موضوع بدلنے پر آمادہ کیا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے ان کا دھیان ہٹایا۔ اس دن میں نے ان سے احتیاطاً ان کا پتا اور چند حوالے پوچھ کر ایک کاغذ پر لکھ لیے تاکہ آئندہ کسی ایسی ہنگامی صورت میں کام آسکیں۔ انہوں نے بے دلی سے مجھے اپنا پتا نوٹ تو کروا دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ خاص طور پر یہ تاکید بھی کی کہ میں حتی الامکان کوشش کروں کہ یہ پتا راز ہی رہے اور صرف اور صرف ان کی موت کی صورت میں ہی ان کے گھر والوں سے کوئی رابطہ کیا جائے۔ میں نے جب چونک کر ان کی جانب دیکھا تو وہ مجھے ایک بے حد ٹوٹے ہوئے انسان دکھائی دیئے۔ ”لمبی کہانی ہے میاں..... پر تمہیں سناؤں گا ضرور..... تم نے میرا دل جیت لیا ہے بس ذرا میری طبیعت سنبھل جانے دو.....“ میں نے انہیں دماغ پر زیادہ زور ڈالنے سے منع کیا اور انہیں نیند کی گولی دے کر باہر صحن میں چلا آیا۔ سفید بادلوں کے چند آوارہ ٹکڑے نیلے آسمان پر آنکھ پجھکی کھیل رہے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک کسی پہاڑی کی چوٹی کے پیچھے جا پھپھتا اور پھر باقی سب اسے ڈھونڈنے کے لیے ہوا کے دوش پر اس کے پیچھے بھاگے جاتے۔ پھر ان میں سے کوئی ایک اسے جا پکڑتا اور ان کے پیچھے باقی لگ جاتے۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک ہوا، آسمان اور بادلوں کا یہ لافانی کھیل دیکھتا رہا۔ تبھی نرم چمکیلی دھوپ نے درگاہ کی منڈیروں کو چوم چوم کر انہیں الوداع کہنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ان سے یہ وعدہ بھی کرتی جاتی کہ کل صبح وہ پھر ان سے ملنے آئے گی، لہذا وہ اسے نہ ہوں۔ لیکن شام ڈھلنے کے ساتھ ساتھ میری اداسی تو بڑھتی ہی تھی، مجھے یہاں اس دھوپ جیسا کوئی دوست میسر نہیں تھا جو اس شرط پر مجھ سے الوداع ہوتا کہ ”کل پھر ملیں گے.....“ مغرب کی اذان کا وقت ہو چلا

تھا۔ میں منڈیر پر رکھے دیئے جلانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ نیچے گھاٹی میں بشرے کے تانگہ کی مخصوص گھنگھروں بھری ٹاپ اور اس کے سل خوردہ بھونپوکی آواز سنائی دی۔ میں نے باہر نکل کر نیچے جانے والے رستے سے جھانکا تو وہ نیچے سے ہی چلایا۔ ”او عبداللہ باؤ جی..... آپ کو خان صاحب نے ابھی بلایا ہے۔ جلدی سے نیچے آ جاؤ۔“ خان صاحب کے بلاوے کا سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ کہیں بڑی مالکن، یا لاریب نے انہیں رات والے واقعے کا تو نہیں بتا دیا؟ اگر ایسا ہوا تو خواہ مخواہ جمالے کی شامت آ جائے گی۔ میں اسی سوچ میں گھرا بیٹھنے لگا تو بشر اتنا تگ موڑ کر بالکل تیار کھڑا ملا۔ میں نے اس سے معاملہ پوچھا تو بولا۔ ”پتا نہیں جی..... خان صاحب سے ملنے کچھ مہمان بڑی سی گاڑی میں آئے ہیں کہیں دور شہر سے..... اس کے بعد خان صاحب نے مجھے یہاں بھیج دیا..... معاملہ تو اب آپ انہی سے پوچھنا۔“ میں الجھن میں پڑ گیا کہ خان صاحب نے اپنے مہمانوں کی آمد کے بعد بھی اگر مجھے بلاوا بھیجا ہے تو اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ اس ادھیڑ بن میں ہم حویلی پہنچ گئے۔ مجھے کوئی گاڑی حویلی کے باہر کھڑی دکھائی نہیں دی۔ شاید اسے حویلی کے اندرونی احاطے کے پیچھے والے گیراج میں پارک کر دیا گیا تھا جہاں خان صاحب کی اپنی گاڑیاں پارک ہوتی تھیں۔ حالانکہ میں نے کبھی گاڑوں میں آتے جاتے انہیں اپنی کوئی گاڑی استعمال کرتے نہیں دیکھا تھا۔ شاید وہ گاڑیاں صرف شہر آنے جانے کے لیے استعمال میں آتی تھیں۔ کرم دین میرے پہنچنے ہی جلدی سے اندرونی ڈیوڑھی سے برآمد ہوا اور مجھے حویلی کے اندر والے بڑے کمرے کی طرف چلنے کا کہہ کر حسب معمول بنا میرا جواب سنے آگے بڑھ گیا۔ میں نے جھجکتے ہوئے اندر کی جانب قدم بڑھادیئے۔ میں اب تک جتنی بار بھی حویلی آیا تھا میرا تعلق صرف اس بیرونی مہمان خانے والے حصے تک ہی رہا تھا۔ آج پہلی بار مجھے اس اندرونی ڈیوڑھی سے گزر کر اصل حویلی میں قدم دھرنے کا اتفاق ہوا تو کچھ عجیب سی چٹکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ جانے وہ کون سے خاص مہمان تھے جن سے ملوانے کے لیے خان صاحب نے مجھے اپنی حویلی کے زنان خانے کی سرحد بھی پار کروا دی تھی۔ بڑے کمرے سے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں اور جب میں نے بڑی سی چٹک اٹھا کر اندر کمرے میں قدم رکھا تو میرے پاؤں جیسے زمین میں ہی گڑ کر رہ گئے۔ میرے بالکل سامنے والے صوفے پر مہمان بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کے سامنے خان صاحب کے ساتھ چپا بیٹھے سگار پی رہے تھے اور زور و شور سے کوئی بحث جاری تھی۔ ممانے مجھے یوں جے دیکھا تو تو خود ہی لپک کر مجھ تک پہنچیں اور انہوں نے مجھے زور سے بھیج کر گلے لگا لیا۔ چپا بھی اٹھ کر ہماری جانب چلے آئے۔ ماما کی آنکھوں سے جیسے برسوں کا رکا سیلاب بہہ نکلا۔ چپا بھی ہم دونوں کو چپ کرواتے کرواتے اپنی آنکھیں جھگو بیٹھے اور ان دونوں کو دلاسا اور تسلی دیتے دیتے میرے اپنے آنسو میرے گالوں سے چپکتے ہوئے ماما کے دامن کو بھگونے لگے۔ ابھی دو دن پہلے ہی تو میں نے چپا سے فون پر بات کی تھی اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ میرے لیے بے حد اواس ہیں۔ اگر کل اصغر صاحب بیمار نہ پڑتے تو میں خود ان سے ملنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ لیکن میرے فون کے بعد ماما سے رہا نہیں گیا اور وہ سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے چپا سمیت یہاں آ پہنچی تھیں۔ مجھے ماما کی طرف سے یہ سختی سے تاکید تھی کہ میں جہاں بھی بمیرا کروں، اپنے مکمل چتے سے سب سے پہلے انہیں آگاہ کروں۔ اس لیے مجھ تک پہنچنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی اور جیل پور میں جب اتنی بڑی گاڑی داخل ہوئی تو سبھی نے یہی سمجھا کہ ہونہ ہو یہ ان کے خان صاحب کے ہی مہمان ہوں گے، لہذا جس پہلے راہ گیر سے راستہ پوچھا گیا وہ انہیں درگاہ کے بجائے سیدھا خان صاحب کی حویلی تک لے آئی۔ نتیجتاً اس وقت ماما چپا دونوں میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے..... ماما کی آنکھیں اب بھی بار بار چٹکلی جاتی تھیں اور میں نے محسوس کیا کہ ہم تینوں کو یوں روتا دیکھ کر خود خان



صاحب کی آنکھیں بھی نم ہو چلی تھیں۔ بڑی مشکل سے میں نے ماما اور پاپا کو سنبھالا۔ ماحول کی اداسی کچھ کم ہوئی تو خان صاحب نے شکوہ کر ہی ڈالا۔ ”تو عبداللہ میاں..... تم عبداللہ نہیں ساحر ہو..... لیکن میاں تم نے ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کر دی..... اب جیل پورا لے اس زیادتی کا قرض کیسے اتاریں گے.....؟“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں اب عبداللہ ہی ہوں۔ ہاں اس سے پہلے ساحر تھا لیکن آپ سے میرا تعارف عبداللہ ہی کی حیثیت سے ہوا تھا۔ براہ کرم ساحر کے تعارف کی دیوار کو ہمارے رشتے میں حائل نہ کیجئے اور آپ نے ہمیشہ مجھ سے بے حد مہربانی کا سلوک روا رکھا ہے جس کے لیے میں ہمیشہ آپ کا احسان مند رہوں گا.....“

خان صاحب ابھی تک حیرت کے عالم سے باہر نہیں نکل پائے تھے۔ ”مجھے ابھی تک پوری طرح یقین نہیں آ رہا کہ کوئی اپنا محل اور شہر ادوں جیسی زندگی چھوڑ کر، صرف ایک کھوج کے لیے یوں کنیا کی زندگی اختیار کر سکتا ہے اور وہ بھی اس دور میں جب ظاہری شان و شوکت اور بے انتہا دولت ہی لوگوں کی زندگی کا مقصد اور معیار بن چکی ہو..... یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے.....؟“ اتنے میں اندر زنان خانے سے ماما کے لیے بڑی مالکن کا پیغام آ گیا کہ وہ کھانے میں ان کی پسند کا پوچھ رہی ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ رات کے کھانے کی تیاری تک وہ اندر زنان خانے میں رہیں تو انہیں بہت خوشی ہوگی۔ میں جانتا تھا کہ ماما کا دل میرے پاس سے اٹھ کر جانے کو نہیں چاہ رہا ہوگا لیکن وہ دنیا کے بھرم اور تقاضے نبھانے بھی خوب جانتی تھیں۔ لہذا فوراً اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ پاپا میرا ہاتھ پکڑے وہیں صوفے پر بیٹھے خان صاحب کے ساتھ بیٹھیں ہانکتے رہے مگر خان صاحب کی نظر بار بار پھسل کر مجھ پر پڑتی رہی۔ کبھی کبھی انسان کا رتبہ اور دنیاوی مقام بھی اسے ایک عجوبہ ہی بنا دیتا ہے۔ شاید اس وقت میری حیثیت بھی وہی تھی۔ مجھے اوپر درگاہ میں پڑے اصغر صاحب کی فکر بھی ستا رہی تھی لیکن خان صاحب نے بتا کر میری تسلی کر دی کہ انہوں نے کرم دین اور جمالے دونوں کو ہی اصغر صاحب کی تیمارداری کیلئے اوپر بھجوا دیا ہے اور میری درگاہ وہاں ہی تک وہ لوگ وہیں رہیں گے۔ رات کا کھانا بھی ماما نے اندر زنان خانے میں ہی کھایا۔ پاپا نے کھانے کے بعد خان صاحب سے والدہ کی اجازت چاہی کہ وہ مجھے دو چار دن کے لیے اپنے ساتھ لے کر گھر جانا چاہتے ہیں تو خان صاحب باقاعدہ ناراض ہو گئے کہ یوں رات گئے کیا وہ اپنے مہمانوں کو جانے دیں گے۔ میں نے بھی پاپا کو اصغر صاحب کی بیماری اور اپنی مجبوری کے بارے میں بتایا کہ سلطان بابا نے خصوصی طور پر مجھے یہاں بھیجا ہے لہذا ان کو بتائے بنا یوں درگاہ کو چھوڑ جانا میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔ دوسری طرف خان صاحب مصر تھے کہ برسوں بعد انہیں کوئی اپنے مزاج کا آشنا ملے لہذا خطرے کی چند بازیاب کھیلے بنا اگر انہوں نے پاپا کو واپس جانے دیا تو یہ ”گناہ عظیم“ ہوگا۔ آخر کار گھنٹوں کی بحث اور مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ جو دو چار دن ماما اور پاپا میرے ساتھ گھر میں گزارنا چاہتے تھے اب نہیں خان صاحب کی حویلی میں ہی گزاریں گے۔ مجھے البتہ اتنی چھوٹ دے دی گئی کہ روزانہ صبح و شام درگاہ کا چکر لگا آ کر دوں۔ ہمارے رہنے کے لیے دو کمرے پہلے ہی کھلوادے گئے تھے مگر وہ ساری رات ماما اور پاپا نے میرے کمرے میں مجھ سے باتیں کرتے ہی گزار دی۔ مجھ سے ملنے کے بعد ماما واقعی بہت خوش نظر آ رہی تھیں اور ان کی بیماری بھی کہیں ”اڑن چھو“ ہو گئی تھی۔ میرے کمرے کا دروازہ حویلی کے بائیں باغ کی طرف نکلتا تھا اور پاپا نے بھی میرے ہی کمرے میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا تھا کیوں کہ بہر حال خود انہیں حویلی کے پردے کا خیال رکھنا تھا حالانکہ خان صاحب نے ان کا

اور ماما کمرہ اندر زنان خانے میں ہی لگوایا تھا۔ ماما تو اگلے ہی دن بڑی مالکن کے قصبے یوں سنانے لگ گئیں تھیں جیسے وہ ان کی کوئی برسوں پرانی سہیلی ہوں۔ انہیں لاریب نے بھی بہت متاثر کیا تھا اور اس لڑکی کی زندہ دلی نے تو جیسے ان کا دل ہی جیت لیا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں جب سے ماما اور پاپا نے حویلی آ کر میرا ساحر ہونے کا راز کھولا تھا تب سے مجھے بڑی مالکن کے سامنے جانے کا سوچ کر ہی ایک عجیب سی جھجک گھیر لیتی تھی۔ لیکن میں زیادہ دیر تک ان کا سامنا کرنے سے بچ نہیں پایا۔ اگلی شام جب میں اصغر صاحب کو دوا پلا کر درگاہ سے واپس حویلی لوٹا تو کرم دین نے بتایا کہ خان صاحب پاپا کو اپنی زمینیں دکھانے کے لیے اپنے علاقے کی جانب نکل چکے ہیں اور میرے لیے ماما کا یہ پیغام ہے کہ وہ چائے پر باغ میں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے اپنے جھجکتے قدم حویلی کے باغ کی جانب بڑھا دیئے۔ باغ میں ایک جانب حویلی کے نوکر مالٹے کے درختوں کے نیچے چائے کے لوازمات وغیرہ بڑی ٹرالی پر سجانے میں مصروف تھے، لیکن ماما مجھے کہیں آس پاس دکھائی نہیں دیں۔ میں پلٹا ہی تھا کہ میں نے اپنے بالکل سامنے لاریب کو کھڑے پایا۔ اس کے ہاتھ میں بھی چائے کے ساتھ پردے جانے والے ناشتے کی ایک ٹرے تھی۔ میں نے سلام کر کے جلدی سے وہاں سے آگے بڑھ جانا چاہا لیکن وہ تو جیسے میرے ہی انتظار میں تھی۔ اس کی آواز نے میرے قدم جکڑ لئے۔ ”سین.....“ میں نے اس کی جانب دیکھا۔ ”وہ دراصل..... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں آپ سے کیسے معذرت کروں.....“ اس کی پریشانی اس کے ہاتھ پر چمکتی پسینے کی چند نخی بوندوں سے واضح تھی۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”معذرت کیسی.....؟“ آپ نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کہا جس کے لیے آپ معذرت خواہ ہوں.....“ اس نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے..... ورنہ اس رات جمالے نے دروازے پر آپ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ.....“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”جمالے نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا..... دربان کا کام اجنبیوں کو روکنا ہی تو ہوتا ہے..... اور پھر اتنی رات گئے اگر جمالے کی جگہ میں بھی ہوتا تو وہی کرتا جو اس نے کیا۔ آپ دل میں کوئی بوجھ نہ لیں.....“ وہ جلدی سے بولی جیسے اسے میرے آگے بڑھ جانے کا خدشہ ہو۔ ”بوجھ تو میرے دل پر اور بھی بہت سے ہیں، خود میرا رویہ بھی آپ سے کچھ نامناسب ہی رہا ہے..... میرے ذہن میں ان گنت سوال ہیں لیکن فی الحال میں خود انہیں ترتیب نہیں دے پا رہی..... میں بہت الجھن میں ہوں..... آپ یہ سب..... کیسے.....؟“ واقعی شاید اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنی بات کہاں سے شروع کرے۔ ایک دل چسپ بات یہ بھی تھی کہ لوگ ”آپ“ سے ”تم“ تک آتے ہیں۔ میرے معاملے میں وہ ”تم“ سے ”آپ“ تک آئی تھی۔ کیا ہم انسانوں کے یہ سبھی آداب والفاظ صرف ہماری دنیاوی حیثیت اور رتبے کا بدلہ ہوتے ہیں؟ کیا میں ”عبداللہ“ کی حیثیت میں ”آپ“ کہلائے جانے کا حق دار نہیں تھا۔ بہر حال میں نے اس شیشے جیسی نازک لڑکی سے یہ سوالات کر کے اسے مزید پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی اثنا میں اندر سے ماما اور بڑی مالکن بھی نکل آئیں۔ میں نے انہیں سلام کیا تو بڑی مالکن نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر عادے دی ”جیتے رہو.....“ پھر نہ جانے کیوں ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے..... تمہاری امی نے بتایا ہے کہ تم کتنے اچھے بیٹے ہو.....“ جس بات کا مجھے خدشہ تھا، وہی بار بار سامنے آ رہی تھی۔ مجھے اب درگاہ کے مجاور کے طور پر نہیں بلکہ ملک کے ایک مشہور صنعت کار کے بیٹے کے طور پر برتا جا رہا تھا۔ جانے اس لمحے مجھے ایسا کیوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے آنے والے دن اور درگاہ کی وہ سادہ سی زندگی بہت زیادہ تکلفات میں گھرنے والی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی چائے ختم کی اور وہاں سے اٹھنے کی ٹھانی تو بڑی مالکن، جولا ریب کے ساتھ بیٹھیں



مما سے باتیں کر رہی تھیں، انہوں نے مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور اندر سے ایک نیا سویٹر مگا کر میرے حوالے کیا۔  
 ”انکار مت کرنا..... اس میں میری خوشی چھپی ہے.....“

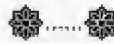
میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ مما شاید میری اندورنی جھجک کو جان گئیں تھیں۔ لہذا انہوں نے مجھے اندر کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔ اگلے دو دن میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ دوبارہ میرا سامنا بڑی مالکن، لاریب سے نہ ہونے پائے شاید میں ان دونوں کی آنکھوں میں چھلنے سوالات کی یلغار سے بچنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ ایسے ہی سوالات کا سامنا مجھے خان صاحب کی نظروں سے بھی تھا۔ بہر حال وہ ایک وضع دار شخص تھے اور میری چٹکیا جھٹ کی وجہ سے جان بچے تھے کہ میں اس موضوع سے کتراتا ہوں۔ لہذا انہوں نے دوبارہ مجھے کسی امتحان میں ڈالنے سے گریز ہی کیا۔ جو تھے دن پپا نے خان صاحب سے اجازت چاہی تو بات پھر گلوں شکوؤں سے ہوتی ہوئی مزید تین دن رکنے تک چلی گئی اور یوں ساتویں دن بمشکل ماما پپا کو خان صاحب اور بڑی مالکن سے واپسی کی اجازت ملی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اب وہ لوگ یہاں آتے جاتے رہیں گے۔ میں نے پہلے ہی ماما پپا سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ لوگ وقت رخصت اپنی آنکھیں نہیں بھگوئیں گے اور خوشی خوشی الوداع کہہ کر جائیں گے، لیکن یہ کم بخت الوداع ہمیشہ سے ہی خود میرا اپنا اندر کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ سو اس مرتبہ اگر ماما پپا نے خود پر قابو پائے رکھا تو خود میری آنکھیں ماما سے گلے ملتے ہی نم ہو گئیں۔ بس پھر کیا تھا ماما تو پہلے ہی تیار بیٹھی تھیں، اور ماں کی آنکھ کا سا لون تو سدا ہی جاری رہتا ہے، پھر چاہے وہ آنکھ کے سوتوں سے باہر کو برے، یا پھر دل کے اندر کی زمین کو دھوٹا رہے۔ ماما کو سنبھالتے سنبھالتے پپا بھی نڈھال سے ہو گئے اور پھر بڑی مالکن، لاریب اور آخر میں خان صاحب بھی اپنی آنکھیں پونچھتے نظر آئے۔ ہم سب اس وقت حویلی کے بیرونی مہمان خانے والے حصے میں جمع تھے۔ جہاں پپا کا ڈرائیور پہلے ہی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ماما نے حسب معمول جدا ہوتے وقت تب تک اپنی لیمتھوں کا سلسلہ جاری رکھا جب تک پپا نے مسکراتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ نہیں کر دیا گاڑی چلنے کے دوران بھی ماما کی سدا بہار ہدایات کا پروگرام جاری رہا اور میں تب تک ہاتھ ہلاتا رہا جب تک ان کی گاڑی دھول اڑاتی ہوئی گاؤں کی واحد کچی سڑک پر اوجھل نہیں ہو گئی۔ میں نے پلٹ کر خان صاحب سے بھی اجازت چاہی۔ پچھلے چھ دن سے میں ماما پپا کی وجہ سے اپنے فرائض پر مکمل دھیان نہیں دے پا رہا تھا اس لیے جلد از جلد درگاہ پہنچ کر اپنے معمولات کی طرف دھیان دینا چاہتا تھا۔ خان صاحب نے رات کے کھانے تک رکنے کا کہا لیکن میں نے طریقے سے معذرت کر لی۔ بڑی مالکن اور لاریب بھی ان کے پیچھے ہی کھڑی مجھے تک رہی تھیں۔ میری معذرت پر بڑی مالکن نے شرط لگا دی۔

”ٹھیک ہے..... لیکن تمہیں اس شرط پر رخصت ملے گی کہ اب گاہے بگاہے یہاں آتے رہو گے..... یہ اب تمہارا بھی گھر ہے..... خبردار جو کبھی کوئی غیریت برتی.....“

میں نے مسکرا کر انہیں یقین دلایا کہ ”میں یہاں آپ کی حویلی سے اپنے پن کی ایسی سوغات لے کر جا رہا ہوں جو اب غیریت کی ایسی کسی دیوار کو کبھی ہمارے رشتوں کے درمیان حائل نہیں ہونے دے گی۔“ لاریب جو ان کے ساتھ کھڑی غور سے مجھے دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں شرارت کی ایک چمک سی لہرائی اور وہ بے اختیار بول پڑی۔ ”انسان کے پاس لفظوں کا اتنا خوب صورت ذخیرہ ہوتا ہے استعمال کرنے میں اتنی کنجوشی نہیں کرنی چاہئے۔“ لاریب کی بات سن کر ہم سبھی ہنس پڑے اور میں نے ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھتے وقت ان دل رہا چہروں کی طرف دیکھ کر ہاتھ

ہلایا اور باہر کھڑے بشیرے کے تانگے کی جانب بڑھ گیا۔

جب میں درگاہ پہنچا تو مغرب کا وقت ہو ہی چلا تھا۔ اصغر صاحب کا کہیں اتنا پتا نہیں تھا۔ میں پریشان ہو گیا کہ ابھی خدا خدا کر کے تو ان کی ذرا طبیعت سنبھلی تھی پھر اچانک کہاں نکل گئے۔ میں اس شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اچانک درگاہ کی بیرونی دیوار کی پرلی جانب کسی دو اشخاص کی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ میں چونکا کہ اس زوال کے وقت یہاں کون ہو سکتا ہے۔ میں نے دیوار کے اوپر سے جھانکا اور اصغر صاحب کے ساتھ سرگوشیاں کرتے دوسرے شخص کو دیکھ کر میرے ذہن میں بیک وقت کئی جھماکے ہونے لگے یہ وہی شخص تھا جو پلیٹ فارم پر مجھے دکھائی دینے کے بعد ایک دم غائب ہو گیا تھا۔



**We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers**

**If site is not opening or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com**

**or**

**send message at  
0336-5557121**



## فاصلے ساتھ چلتے ہیں

وہ شخص پہلے مجھے ٹرین کی برتھ پر اور پھر پلیٹ فارم پر دکھائی دیا تھا۔ مجھے اُس کی وہ زوچ کو چیر دینے والی دو چھوٹی چھوٹی جگنوؤں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں کیسے بھول سکتی تھیں اور پھر وہ اُس کا عجیب سا بے چین متحرک اور ہر لمحہ کسی کرب جیسی کیفیت میں رہنے والا منحنی اور لاغر سا وجود.....

لیکن وہ شخص اس وقت یہاں درگاہ کے باہر کیا کر رہا تھا؟ تو کیا وہ اصغر صاحب سے ملنے کے لیے جیل پورا رہا تھا؟ لیکن اگر اُسے اصغر صاحب سے ملنا بھی تھا تو وہ درگاہ کے باہر یوں چوروں کی طرح کیوں اُن سے مل رہا تھا؟ کچھ ہی دیر میں اصغر صاحب بات ختم کر کے جب واپس اندر آئے تب بھی میں وہیں درگاہ کے صحن میں ہی کھڑا تھا۔ وہ مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر کچھ ٹھٹھک سے گئے۔ اُن کا ملاقاتی اندھیرے میں کہیں تحلیل ہو چکا تھا۔ وہ سر جھٹک کے آگے بڑھے ”ارے عبداللہ میاں..... تم.....؟“ تم کب واپس آئے۔ تمہارے امی ابا واپس چلے گئے کیا.....؟“ جی وہ آج واپس لوٹ گئے ہیں..... لیکن آپ بستر سے کیوں اُٹھ آئے.....؟“ اور یہ کون شخص تھا جس سے آپ وہاں اندھیرے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے.....؟“

میرا سوال سن کر جانے مجھے کیوں لگا کہ جیسے وہ کچھ گھبرا سے گئے ہوں۔ ”ہاں وہ..... کوئی نہیں بس یونہی کوئی سائل تھا..... کسی منت کی تفصیلات پوچھنے آیا تھا.....“ پھر جیسے وہ اچانک ہی چونک سے گئے۔ ”تو کیا تمہیں وہ نظر آیا تھا.....؟“ میرا مطلب ہے کہ..... باہر تو بہت اندھیرا تھا۔“

میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا کیوں کہ ابھی تو صرف شام کا جھنڈپٹا ہی چھایا تھا اور ایسا اندھیرا بھی نہیں تھا کہ چہرے بھی پہچانے نہ جا سکیں۔ ”ہاں میں نے اُسے اس سے پہلے بھی دیکھا تھا..... جب میں جیل پورا رہا تھا تب..... پہلے ٹرین اور پھر پلیٹ فارم پر..... لیکن پھر نہ جانے یہ شخص کہاں غائب ہو گیا۔ اُس دن کے بعد آج دکھائی دیا ہے.....“ اصغر صاحب میری بات سن کر نہ جانے پریشان سے کیوں ہو گئے۔ ”اوہ..... اس کا مطلب ہے تم نے اُسے پہلے بھی دیکھا ہے..... لیکن.....؟“ اچھا چلو خیر..... ہوگا کوئی..... تم اپنی سناؤ..... ماں باپ سے مل کر اچھا تو لگا ہوگا.....؟“ میں سمجھ گیا کہ وہ بات ٹالنا چاہتے ہیں۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا اور انہیں حویلی میں پیش آنے والے واقعات بتاتا رہا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن میں اُن کے ملاقاتی کا چہرہ جیسے چپک کر رہ گیا تھا۔ اصغر صاحب کی شخصیت روز بروز ہر اسرار سے ہر اسرار تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ساری رات میں نے کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دی۔ اس لیے صبح ہی سے میرا سر کچھ بھاری سا تھا۔ اگلے دن جمعرات تھی اور حسب معمول ہر جمعرات کی طرح زیارت پر صبح ہی سے زائرین کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی میرے من میں یہ سوال بھی اُٹھتا تھا کہ جمعرات کے دن میں، یا شام میں ایسی کیا خاصیت ہے کہ ان درگاہوں پر خاص اسی دن لوگوں کا اتنا بندھا رہتا ہے۔ مذہبی حوالے سے تو جہد کا دن اہم ہوتا ہے لیکن بعض جگہوں کے علاوہ جمعہ کے دن ان دور دراز کی زیارتوں اور درگاہوں پر سناٹا ہی چھایا رہتا ہے۔ تو کیا یہ روایت مذہب سے کچھ سوا تو نہیں.....؟

شام تک تمام معمولات نبھاتے نبھاتے میں تھکن سے چور ہو چکا تھا اور پھر رات سے سر میں دھماکے کرتا وہ عجیب سا درد..... تیتختا مغرب کا وقت ہوتے ہوتے میرا جسم بخار میں پھٹک رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی میرے رگ و رپ میں جیسے سرایت کرتی جا رہی تھی۔ وہی ایک عجیب سا

احساس..... جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ مغرب سے ذرا پہلے بشر اکرم دین کے ساتھ حویلی سے جمعات کی شام کی مخصوص نیاز کی دیکیں لے کر اُوپر درگاہ پہنچا اور مختلف زائرین اور سالکوں کو کھانا کھلانے کے دوران اُس کا ہاتھ جب اتفاقاً میرے ہاتھ سے چھو گیا تو وہ اُچھل ہی پڑا۔ ”اوجی یہ کیا..... آپ کو تو شدید تپ چڑھ رہا ہے عبداللہ باؤ..... اور آپ پھر بھی کام کر رہے ہیں۔“ اور پھر میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود زبردستی مجھے درگاہ کی بیرونی دیوار کے ساتھ بھیجی در یوں کے قریب بٹھا کر جھٹ پٹ کرم دین کے ساتھ کھانا بانٹ کر نیچے گاؤں سے دوا لینے چلا گیا۔ میں نے اُسے سختی سے تاکید کی کہ اس بات کا حویلی والوں کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ اصغر صاحب حسب معمول پورا دن کہیں غائب رہے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ جمعات کے روز خاص طور پر کہیں ٹل جاتے ہیں اور درگاہ پر آیا ہوا نیاز کا کھانا، یا گوشت تو خاص طور پر چکھتے تک نہیں۔ اس روز بھی وہ آخری سالک کے جانے کے بعد ہی درگاہ واپس لوٹے۔ لیکن میری حالت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئے اور فوراً ہی انہوں نے ٹھنڈے پانی میں بھیگی پیٹیاں بنا کر میرے ماتھے پر رکھنا شروع کر دیں۔ کچھ دیر میں میں خاصا بہتر محسوس کرنے لگا۔ وہ ساتھ ساتھ مجھ سے باتیں بھی کرتے رہے۔ ”میں آج نیچے بازار گیا تو تمہارے گھر والوں کے بارے میں پتا چلا۔ بھی تمہارے والد تو بہت بڑے صنعت کار ہیں۔ بچ چھو تو میں اب تک شدید حیرت کے جھکے میں ہوں کہ اتنے بڑے گھرانے کا لڑکا اور وہ بھی اس عمر میں اس راہ پر چل نکلا ہے..... اور وہ بھی یوں بے سروسامان..... یہ کیسا جنون ہے.....؟ یہ کیسی تلاش ہے.....؟ میں اب تک سمجھ نہیں پایا.....؟“

مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں بول پڑا ”آپ بھی تو کسی ایسے ہی جنوں کے اثر میں یہاں تک پہنچے ہیں..... ہو سکتا ہے ہماری کہانی مختلف ہو لیکن ہمارے حالات مختلف نہیں ہو سکتے.....“ انہوں نے جلدی سے مجھے ٹوکا ”خدا نہ کرے عبداللہ میاں..... کہ ہمارے حالات کبھی ایک جیسے ہوں۔ خدا تمہیں ایسی ہر آزمائش سے بچائے جس سے گزر کر میں یہاں تک پہنچا ہوں..... انگاروں بھری وہ راہ خدا کسی دشمن کے حصے میں بھی نہ بچائے.....“ میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا لیکن اُن کو ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اپنی رو میں بولے جا رہے تھے۔ ”میں اُسی دن سمجھ گیا تھا کہ تمہارا واسطہ ضرور خدا کے کچھ خاص بندوں کے ساتھ رہا ہے جس دن تم نے اس درگاہ میں قدم رکھا تھا اور پھر کل جب تمہیں مجھ سے باتیں کرتا وہ شخص بھی دکھائی دے گیا تو میرا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ واقعی تم باقیوں سے مختلف ہو، کچھ خاص ہو.....“

”آپ نے کل بھی اُس شخص کا ذکر کچھ عجیب سے الفاظ میں کیا تھا۔ ایسی کون سی بات ہے.....؟ آخر کیا مجید ہے اُس شخص کی پہچان میں.....؟ آپ بتا کیوں نہیں دیتے.....؟“

اصغر صاحب نے ایک لمبا سانس لیا۔ ”سوچنا ہوں بتا ہی دوں۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ میری کہانی سن کر تمہارے پاس میرے لیے سوائے نفرت اور حقارت کے اور کچھ نہیں بچے گا۔ لیکن شاید یہی نفرت، یہی بربادی اور یہی حقارت میرا مقدر ہے، سدا کے لیے..... اپنا ایمان بیچنے والا شخص کسی ایسے ہی، یا شاید اس سے بھی بدتر سلوک کا حق دار ہوتا ہے.....“ میں چپ رہا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ آخر کار وہ گرہ کھٹنے ہی والی ہے جس نے اصغر صاحب کی شخصیت کو اتنا پُر اسرار بنا رکھا ہے۔ ہم دونوں درگاہ کے صحن میں نکل آئے جہاں سردی سے بچنے کے لیے زائرین نے جنگل کی لکڑیوں کو جلا کر شام سے ایک بڑا سا لاؤ روشن کر رکھا تھا۔ اب صحن بالکل خالی ہو چکا تھا لیکن اصغر صاحب نے ایک شاخ کی مدد سے لکڑیوں کی راکھ کو کرید اور چند مزید تختے اس انگاروں بھری راکھ میں پھینکے تو پھر سے آگ بھڑک اُٹھی اور ہم دونوں بھی اسی الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔ اصغر صاحب نے اپنی یادوں کی راکھ



کو بھی اپنی سوچ کی کسی لمبی چھڑی سے کرید اور پھر دھیرے دھیرے اُن کے ماضی کی سنگتی آگ بھی اُن کی سوچ کی لکڑیوں کو چٹکانے لگی۔

”میری کہانی آج سے ٹھیک ایک سال پہلے، دسمبر کے اسی مہینے سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے میری زندگی میں کوئی فسانہ، کوئی کہانی نہیں تھی۔ میں ایک عام سینئر کلرک کی بوسیدہ اور مچھل چڑھی زندگی گزار رہا تھا۔ ایک بہت بڑے شہر کے ایک چھوٹے سے دو کمروں کے فلیٹ میں اپنی لڑاکا بیوی اور چار بدتمیز بچوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں اور تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ بڑے شہروں کے ان ڈربہ نما فلیٹوں میں ہم چھ بندے کس طرح گزارہ کرتے ہوں گے۔ میرے دونوں بیٹے ماں کے لاڈ پیار کی وجہ سے کسی کام کے نہیں رہے تھے۔ بڑا کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد گریجویشن تو پاس کر چکا تھا مگر کم نمبروں کی وجہ سے شہر بھر میں جوتے جھٹکاتا پھرتا تھا اور چھوٹے نے تو بی اے میں ایک مرتبہ فیل ہونے کے بعد کتابوں سے نا طبعی توڑ لیا تھا۔ دونوں بیٹیاں بھی دن بھر سوائے فیشن میگزین پڑھنے، یا کیبیل پر ٹائمیں دیکھنے کے علاوہ اور کچھ خاص نہیں کرتی تھیں۔ بڑی بیٹی نے البتہ یونیورسٹی کے بعد کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لی تھی جب کہ چھوٹی ہارویں کا امتحان پاس کرتے ہی کسی شہزادے کے انتظار میں دن بھر میک اپ کورسز پر اپنا دھیان لگائے رکھتی تھی۔ دراصل بچے ہمیشہ ماں میں اپنا آئیڈیل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں اور ماں کو ہی فالو (Follow) کرتے ہیں اور میرے بچوں نے ہمیشہ اپنی ماں کو اپنے باپ کے ساتھ لڑتے جھگڑتے، طعنے دیتے اور گلے شکوے کرتے ہی دیکھا تھا۔ لہذا قدرتی طور پر اُن کے دل سے میری عزت جاتی رہی تھی۔ اور رفتہ رفتہ وہ دکھاوے کے لحاظ اور شرم و حیا سے بھی رہ چکے تھے۔ اور اب ترکی بہ ترکی مجھے جواب دینے لگے تھے۔ شاید اس میں میری بیوی کا بھی اتنا قصور نہیں تھا۔ میں زندگی میں کبھی کوئی بھی آسائش انہیں مہیا نہیں کر پایا تھا۔ ایک سینئر کلرک کی تنخواہ ہوتی ہی کتنی ہے اور پھر اوپر سے مہنگائی کا یہ طوفان..... تنخواہ سے زیادہ تو بجلی اور گیس کے بل ہر ماہ سینے پر مونگ دلنے کے لیے آجھپتے تھے۔ ایسے میں نگاہائے کیا اور نچوڑے کیا؟ میں کبھی ضرورت کے مطابق بھی پیسے گھر نہیں لایا تھا تو پھر تفریح، پکنک، یا سینما کی تو بات کرنا ہی فضول تھا۔ میرے بچے اور بیوی ساری عمر پیٹ بھر کھانے کو ہی ترستے رہے۔ بیٹی نے نوکری کی تو بیوی کا ہاتھ کچھ کھلا لیکن یہ بھی میرے لیے مزید ایک طعنے کا سبب بن گیا کہ ”ہاں بھئی..... اب تو بیٹی کی کمائی کا ہی آسرا ہے.....“ اپنی ساری نوکری میں مجھے کلرک کے لیے شعبے بھی کچھ ایسے ہی دیئے جاتے رہے جہاں رشوت لینے کے مواقع بھی کبھی مجھے میسر نہیں رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ٹھیک طرح سے رشوت لینا بھی نہیں آتی تھی۔ ایک آدھ مرتبہ کسی سے کہلو کر کسی کمائی والے سیکشن میں تبادلہ کروا بھی لیا تھا لیکن کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ رشوت لینا بھی ایک فن ہے اور میں اس فن سے قطعی نا بلد تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے تھے اور ذرا سی رقم پکڑتے وقت بھی پورا جسم لرزنا شروع کر دیتا تھا۔ لوگ نہ جانے کیسے اتنی بڑی بڑی رقموں کو بناؤ کار لیے جیب میں ڈال کر ہضم بھی کر لیتے تھے۔ شاید میں شروع سے ہی بزدل تھا اور رشوت لینا، یادینا مجھ جیسے بزدلوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے وہ دو چار ہفتوں میں ہی اس کمائی والے محکمے کے راشی انفرنے میرے آگے ہاتھ پاؤں جوڑنا شروع کر دیتے تھے کہ ”بس بہت ہو گیا میاں۔ اب یہاں سے چلتے بنو۔“ دراصل میری وجہ سے اوپر والوں کا لین دین بھی بگڑا تھا کیوں کہ بہت سی جگہوں پر مجھ جیسے کلرک ہی ایسے کالے دھندوں کا پہلا دروازہ ہوتے ہیں۔ یوں میرے دن قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہی گزار رہے تھے۔ میری صبح کا آغاز میرے سر ہانے رکھے الارم کلاک کی چیخ سے ہوتا تھا جسے میری بیوی بدمزگی سے بند کروا کر دوسری کمرٹ دوبارہ یہ بڑبڑاتے ہوئے سو جاتی کہ ”نہ خود سوتے ہیں نہ دوسروں کو سونے دیتے ہیں۔“ میں کچی اور بے آرام نیند سے تھکا ہارا جاگتا تو پورے گھر میں کوئی مجھے ایک پیالی چائے کا پوچھنے والا بھی نہ ہوتا۔ بیوی کو

تو ویسے ہی اپنے آرام میں خلل پسند نہیں تھا۔ بڑی بیٹی کو اپنی نوکری پر جانے کی جلدی ہوتی، چھوٹی بیٹی کبھی خوش قسمتی سے جاگتی ہوئی مل بھی جاتی تو وہ خود اس انتظار میں ہوتی کہ کوئی باورچی خانے میں جائے تو اُس کے لیے بھی ایک کپ چائے بنا دے اور بیٹے تو ویسے ہی دن چڑھے جاگنے کے عادی تھے۔ مجھے ہر صبح ساڑھے چھ بجے والی ٹرام پکڑنی ہوتی تھی کیونکہ اسی صورت میں میں دو بیس بدل کر ساڑھے آٹھ بجے دفتر پہنچ سکتا تھا۔ یہ تو شکر ہے کہ سرکاری دفاتروں میں کلرک بادشاہ ہوتے ہیں اور انہیں ایک آدھ گھنٹہ لیٹ پہنچنے پر کوئی کچھ کہتا نہیں ورنہ دفتر کا اصل وقت تو صبح آٹھ بجے ہی تھا۔ دن بھر دفتر میں جھک مارنے کے بعد اور مانگنے کی چائے پینے کے بعد شام چار بجے جب میں وہاں سے فارغ ہوتا تو مجھے ایک اور پرائیویٹ دفتر میں چار سے سات کی عارضی نوکری بھی بھگتانی ہوتی تھی جو میں نے اپنے قرضے اُتارنے کے لیے کر رکھی تھی۔ کچھ ڈسپنچر کا کام ہوتا تھا، یا پھر چند دفتری خط تیار کرنا ہوتے تھے لیکن اس پرائیویٹ دفتر کا باس عظیم ایک نمبر کا ”کھڑوں“ شخص تھا۔ مجال ہے جو مل بھر کی دیر بھی برداشت کر جائے اور شومنی قسمت میں ہمیشہ دس پندرہ منٹ لیٹ ہونی جاتا تھا کیوں کہ اپنے سرکاری دفتر سے نکل کر مجھے پیدل ہی دو بلاک چل کر اُس نجی آفس تک آنا ہوتا تھا اور یوں دیر سے آنے پر روز ہی عظیم مجھے اپنی خوب صورت لیڈی سیکرٹری شبانہ کے سامنے جی بھر کر بے عزت کرتا تھا۔ مجھے اس بے عزتی کی بھی خاص پروا نہ تھی کیوں کہ یہ نوکری میری انتہائی مجبوری تھی لیکن اس بے عزتی کے دوران مجھے شبانہ کی موجودگی بے حد گھلٹی تھی۔ کیوں کہ وہ میری بے عزتی کے دوران مستقل اپنا نچلا ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبا کر ایک طنزیہ ہنسی ہنستی رہتی تھی اور مجھے یوں لگتا تھا کہ کوئی مجھے سر بازار دنگا کر رہا ہو۔ جانے عظیم کو اس طرح ایک عورت کے سامنے مجھے بے عزت کر کے کیا ملتا تھا۔ شاید اس تحریک کے پیچھے بھی عظیم کا کوئی انتقام ہی چھپا ہوا تھا کیوں کہ میں نے ایک دن غلطی سے کسی خط کی تصحیح کے لیے بنا دستک دیئے عظیم کے دفتر کا دروازہ کھول لیا تھا اور ٹھیک اسی وقت عظیم اپنی سیکرٹری کو اپنے بہت ہی قریب بٹھائے کوئی ڈکٹیٹنگ (Dictation) دے رہا تھا۔ دروازہ کھلنے پر شبانہ تو بوکھلا کر باس کی گود سے اتر گئی لیکن عظیم کا چڑھا ہوا پارہ پھر کبھی نہیں اُترا۔ اُس دن اُس نے مجھے جی بھر کے ذلیل کیا کہ دراصل میں اُس کی جاسوسی کرتا پھرتا ہوں اور مجھے اتنے بڑے دفتر میں کام کرنے کے آداب بھی نہیں آتے اور یہ کہ اگر میں نے باہر جا کر دفتر کے دوسرے لوگوں کے سامنے اس واقعے کا ذکر کرنے کی کوشش بھی کی تو وہ مجھے دھکے مار کر یہاں سے باہر نکال دے گا۔ ویسے اُسے اس وقت بھی ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا لیکن فی الحال اُس نے شاید یہ سوچ کر اپنے دل پر پتھر رکھ لیا تھا کہ میں یوں فوراً دفتر سے بے دخل کر دیئے جانے پر اُس کے خلاف انتقامی کارروائی کے طور پر اس واقعے کی دفتر میں اور باہر تشہیر ضرور کروں گا۔ حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ میرے اندر اتنی سکت بھی نہیں تھی۔ بہر حال اُس دن کے بعد سے عظیم کا غصہ کبھی کم نہیں ہوا اور مجھے روزانہ کسی نہ کسی بہانے سے شبانہ کے سامنے بے عزت ضرور کیا جاتا رہا۔ میں جتنی بھی دیر سے اپنے دوسرے دفتر پہنچتا، اتنے ہی وقت کے لیے مجھے دفتر کے اوقات کے بعد اور ڈائنامک لگا کر اپنا کام ختم کرنا پڑتا تھا، کیوں کہ عظیم آج کا کام کل پر چھوڑنے کا بالکل قائل نہیں تھا۔ لہذا مجھ سے عام طور پر شام ساڑھے سات بجے والی آخری بس بھی چھوٹ جاتی تھی جس کے بعد پیدل مارچ کر کے رات گئے گھر پہنچنا میری مجبوری بن جاتی تھی اور رات دیر سے گھر پہنچنے کے بعد پھر سے وہی بیوی کے طعنے اور بچوں کی کڑوی کیلی باتیں کہ ”دن بھر گھر سے غائب رہتے ہو۔۔۔۔۔ بیوی بچوں کا بھی کچھ خیال ہے، یا نہیں۔۔۔۔۔ یا بس تمہارا فرض جنم دینے کی حد تک ہی تھا۔ اب پڑے سڑتے رہیں۔۔۔۔۔ جانے کہاں دن بھر آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ بھی ہم نے تو ایسا دفتر کبھی دیکھا نہ سنا۔۔۔۔۔“ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا تھا کہ کہیں سے نہر کی چار پڑیاں لا کر گھر والوں کے کھانے میں ملا دوں تاکہ یہ روز روز کا جھگڑا ہی منٹ جائے لیکن یہاں



بھی میری وہی ازلی بزدلی آڑے آجاتی تھی اور میں چپ چاپ کان لپیٹ کر کسی کونے میں پڑ کر سو رہتا۔ ایک اگلے اور نئے دن کے کانٹوں بھرے آغاز اور دوبارہ اسی ذلت بھری زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے.....“

اصغر صاحب بولتے بولتے چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے تو مجھے پتا چلا کہ میں اُن کی کہانی میں اس قدر رکھوسا گیا تھا کہ مجھے رات کے ڈھلنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ ابھی میں نے عشاء کی نماز بھی ادا کر لی تھی اور اپنے اور اصغر صاحب کے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ شام کو گرم دین کی لائی ہوئی دیگوں میں سے کچھ بچ گیا تھا لہذا میں نے جلدی سے وہی چاول گرم کر کے اصغر صاحب کے سامنے رکھے اور خود عشاء کی نماز ادا کرنے کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

نماز پڑھ کر میں باہر نکلا تو اصغر صاحب ایک مرتبہ پھر سے لکڑیوں کے الاؤ کو دھکا چکے تھے۔ اُن کے چہرے پر آگ کی لپٹوں سے پڑتی روشنی میں صاف دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنی کہانی دہراتے وقت کس اذیت سے گزر رہے ہیں۔ میں چپ چاپ دوبارہ اُن کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے بات وہیں سے جوڑی۔

”ہاں تو عبداللہ میاں..... میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میں اس ذلت بھری زندگی کا عادی ہو چکا تھا اور اپنے دن کسی کلوہوے تیل کی طرح کاٹ رہا تھا۔ پھر ایک دن ایک اور غضب ہوا کہ میں نے بس پر چڑھتے ہوئے گھر واپسی کے وقت اپنی بڑی بیٹی لہنی کو کسی پکی عمر کے مرد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ دیکھ لیا اور گھر آ کر میں نے باز پرس کی تو بس میرا بات کرنا ہی غضب ہو گیا۔ سارے گھر والے مجھ پر یوں برس پڑے جیسے خود مجھ سے کوئی گناہ عظیم سرزد ہو گیا ہو۔ پتا یہ چلا کہ وہ صاحب اُسی اسکول کے مالک ہیں جہاں لہنی نوکری کرتی تھی اور اُن کا تو اب یہ معمول ہی بن چکا تھا کہ وہ چھٹی کے بعد واپسی پر لہنی کو گھر ڈراپ کرنے آتے تھے۔ اُلٹا بیوی نے مجھے طعنہ دے دیا کہ تم کبھی سر شام گھر واپس لوٹو تو تمہیں کچھ پتا بھی ہو.....؟ بیٹوں نے سیدھی سادھی دھمکی دے دی کہ وہ اپنی بہن کی زندگی کا فیصلہ خود کریں گے۔ لہذا مجھے اس میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں۔ دراصل وہ شخص پورے گھر انے کو تحفے تحائف اور اپنے پیسے کے جال میں کچھ یوں پچائل چکا تھا کہ اب میرے گھر کا کوئی فرد بھی اُس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ مجبوراً ایک بار پھر مجھے ہی چپ سادھنا پڑی۔ لیکن اُس دن سے میرے وجود کے اندر خود اپنے لیے ہی ایک عجیب سی نفرت پلانا شروع ہو گئی کہ آخر میں کس مرض کی دوا ہوں.....؟ میرا اس دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے.....؟ کیا میں یونہی عمر بھر خود اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں ذلیل ہوتا رہوں گا۔ اُس دن زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے خود کشی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا کیوں کہ مجھ جیسے ناکارہ انسان اور نالی کے کیڑے جیسی زندگی گزارنے والے شخص کو مری جاننا چاہیے تھا۔ لیکن کیسے.....؟ خود کشی بھی تو ہمت مانگتی ہے نا..... لیکن میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب اپنی اس بوسیدہ اور ذلت بھری زندگی کا خاتمہ کر کے ہی رہوں گا۔ کب اور کیسے.....؟ بس یہ طے کرنا باقی رہ گیا تھا۔“

کہاں قاتل بدلتے ہیں، فقط چہرے بدلتے ہیں  
عجب اپنا سفر ہے، فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں



## چھلاوہ

امصر صاحب نے پانی کا ایک لہسا گھونٹ بھرا اور اپنی داستان جاری رکھی۔ رات خوب بھیک چکی تھی اور سرد اور خشک ہوا ہمارے جسموں کو چیر کر گزر رہی تھی لیکن ہم دونوں ابھی تک اسی الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

”تو عبداللہ میاں..... میں نے وہ رات کس طرح کانٹوں پر گزاری یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اگلی صبح پھر وہی بیوی کی چیخ چیخ۔ پہلے سرکاری دفتر دیر سے پہنچا اور پھر حسب معمول وہاں افسروں کی ڈانٹ سنتے ہوئے اور اپنا کام لیٹ ختم کر کے دوسرے دفتر بھاگ بھاگ پہنچا تو پورے پندرہ منٹ لیٹ تھا۔ دفتر میں میرے واحد دوست رؤف نے مجھے دفتر میں گھستے ہی بتا دیا کہ باس عظیم تین مرتبہ میرا پوچھ چکا ہے۔ میں دل میں ہزار خدشے لیے اس کے کمرے میں پہنچا تو حسب توقع شہانہ وہیں موجود تھی اور عظیم کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھتے ہی عظیم نے طنز کیا۔“

”آگے نواب صاحب..... اس وقت آنے کی زحمت بھی کیوں کی جناب نے..... آپ حکم تو کرتے..... ہم فالٹز آپ کے گھر ہی بھجوا دیتے۔“

میں ہکھلایا..... وہ سر..... میں وہ..... دراصل۔“

عظیم دھاڑا ”کیا میں میں کی رٹ لگا رکھی ہے..... یہ وقت ہے دفتر آنے کا..... آخر تم کب سدھر دو گے..... تنخواہ لینے والوں کی قطار میں تم سب سے آگے کھڑے ہوتے ہو..... اور کام کے لیے آتے ہوئے موت آتی ہے تم کو۔“

شاید اُس دن عظیم نے میری بے عزتی کرنے کی ہر حد کو پار کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ شہانہ اُسی طرح لگاتار مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور میرے تن من میں جیسے آگ سی بھرتی جا رہی تھی۔ اُس دن مجھے پتا چلا کہ قاتلوں سے قتل کس لمحے میں سرزد ہوتے ہوں گے۔ اُس وقت میرے جسم میں اتنی جان ہوتی، یا میرے پاس کوئی چاقو یا ہسل ہوتا تو میں ضرور اُن دونوں کا وہیں خون کر دیتا۔ مجھے عظیم نے یہ حکم نامہ بھی صادر کیا کہ میں آج پچھلے پورے ہفتے کی فالٹز اور خط نکال کر ہی گھر واپس جاؤں گا ورنہ اگلے دن مجھے دفتر آنے کی ضرورت نہیں اور ان پندرہ دنوں کی تنخواہ میرے گھر پہنچا دی جائے گی۔ میں بکتا جھکتا اس جلا کے کمرے سے نکلا اور اپنی میز پر جا کر فالٹوں کے انبار میں کھو گیا۔ جب تک میں نے کام ختم کیا، شام کے سوا سات بج چکے تھے۔ دسمبر کی شامیں ویسے بھی گہری راتوں میں بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتیں۔ میں دفتر سے نکل کر نیچے بس اسٹاپ پر پہنچا تو حسب توقع آخری بس بھی نکل چکی تھی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو صرف ۲۵ روپے اور پانچ روپے کا ایک سکہ نکلا، مطلب رکشے، یا ٹیکسی کی عیاشی تو ناممکن تھی۔ لہذا میں نے عظیم کو دل ہی دل میں گندی گالیاں نکالتے ہوئے پیدل ہی گھر جانے کی ٹھانی۔ پیدل مختصر راستے اختیار کرنے کے باوجود میرے گھر کا فاصلہ دفتر سے دو گھنٹے کا تھا۔ میں تنگ اندھیری گلیوں اور ویران سڑکوں سے ہوتا ہوا گھر کی جانب روانہ تھا۔ میرے شہر کے حالات بھی



کچھ ایسے تھے کہ ایسے راستوں پر دن میں بھی چلتے ہوئے لوگ خوف محسوس کرتے تھے۔ یہ تو پھر رات تھی۔ لہذا ذرا سی آہٹ پر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ راستے میں ایک ویران سا پارک بھی پڑتا تھا جسے میں نے پہلے اپنی راہ گزر کے لیے منتخب نہ کرنے کا سوچا کیوں کہ اس پارک کے متعلق عجیب و غریب قسم کی باتیں مشہور تھیں لیکن پھر جب میں نے اس لمبے راستے کا سوچا جو پارک کے اندر سے نہ گزرنے کی صورت میں مجھے طے کرنا پڑتا تو خود بخود میرے تھکے ہوئے قدم اس پارک کی ٹوٹی ہوئی دیوار کی جانب بڑھ گئے جسے راہ گیزوں نے اپنی سہولت کے لیے پارک کر اس کرنے کے لیے توڑ رکھا تھا۔ پارک اُس وقت بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ گھاس کے خشک میدان کے پتوں بچ ایک بوڑھا برگد کا پیڑ اپنی ہزاروں جڑیں زمین میں گاڑھے اور میدان کے اوپر پر پھیلائے یوں کھڑا تھا جیسے کوئی بزرگ اپنی ساری آل اولاد کو اپنے دامن میں سمیٹے کھڑا ہو۔ بیڑ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا پتھر کا بیڑ پڑا ہوا تھا۔ جانے کیوں ایک دم ہی مجھے شدید تھکن کا احساس ہوا اور میں نے کچھ پل اُسی بیچ پر بیٹھ کر سستہ کر لیا۔ میں نے بیچ پر بیٹھ کر چند گہری سانسیں لیں تو کچھ سکون کا احساس ہوا۔ میں نے سر پیچھے نکا کر چند لمحوں کے لیے اپنی جلتی آنکھیں موندھ لیں لیکن آنکھیں بند کرتے ہی ایک لمحے کے ہزاروں حصے میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس برگد کے بیڑ کے اوپر کوئی بیٹھا ہوا مجھے اپنی دوسرے انگارہ آنکھوں سے گھور رہا ہو۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں کھول دیں لیکن بیڑ کی شاخیں ویسے ہی سنسان پڑی تھیں۔ میں نے سر جھٹک کر دوبارہ آنکھیں موندھیں تو پھر وہی احساس جھم سے میری بند آنکھوں کے پردے پر اُتر آیا، لیکن اس بار آنکھیں کھولنے سے پہلے ایک آواز بھی میرے ذہن کے پردے سے نکل آئی۔ ”کیسے ہوا صفر.....؟“ میری تو مانو جیسے جان ہی نکل گئی اور میں نے دوبارہ جلدی سے آنکھیں کھول دیں لیکن بیڑ اب بھی ویسے ہی تنہا کھڑا تھا۔ میرے مساموں سے اتنی سردی کے باوجود خوف کے مارے پسینہ نکل آیا اور میں نے وہاں سے بھاگ اٹھنے کی ٹھان لی۔ لیکن ابھی میں نے اپنا بوجھ اپنے دو شل بازوؤں پر ڈالا ہی تھا اور میرا جسم ابھی پوری طرح اٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ پھر سے وہی سرگوشی میرے کانوں سے نکل آئی۔ ”ڈرو نہیں صفر..... میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے اپنا دوست ہی سمجھو.....“

میں نے خوف کے مارے ادھر ادھر دیکھا ”لیکن تم ہو کون..... اور مجھے کھلی آنکھوں سے نظر کیوں نہیں آرہے.....“ میرے کانوں میں پھر سے آواز گونجی ”میں بند آنکھوں سے بھی صرف انہی کو نظر آتا ہوں جنہیں آنا چاہتا ہوں..... اگر تم زیادہ خوف زدہ نہیں ہو تو میں تمہیں کھلی آنکھوں سے نظر آسکتا ہوں۔ تمہیں بس اپنے حواس قابو میں رکھنے ہوں گے.....“ ایک بار تو میرے جی میں آیا کہ میں وہاں سے سر پٹ دوڑ لگا دوں لیکن پھر نہ جانے میرے اندر اتنی ہمت کہاں سے آگئی اور میں نے ہکلاتے ہوئے اُسے اجازت دے دی۔

”ٹھیک..... ہے..... لیکن مجھے زیادہ ڈرانا نہیں۔ میں دل کا کمزور واقع ہوا ہوں۔“ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر درخت کی شاخوں کو دیکھنے لگا کیوں کہ میرے خیال میں اُسے وہیں کہیں سے کودنا چاہیے تھا لیکن میں اپنے پیچھے سے اُس کی آواز سن کر بیچ سے گرتے گرتے بچا۔

”اب تم مجھے دیکھ سکتے ہو.....“

میں نے ڈرتے ڈرتے لرزتے دل کے ساتھ پیچھے نظر ڈالی تو کچھ دیر کے لیے میرے اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا۔ ایک نہایت کالا بھنگ

شخص جس کی آنکھیں دودھ جتنے انگاروں جیسی چمک رہی تھیں اور جس کی جلد کا رنگ ایسا تھا جس کی رات کی سیاہی میں جانچ، یاد رکھ پانا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ میں نے فوراً خوف کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک کسی کی کرخت آواز فضا میں گونجی ”اوہا ہا..... تم اس اندھیرے میں کیا کرتا ہے.....؟ میری توجہ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے ڈر کر جھٹ سے آنکھیں کھولیں تو سامنے پارک کا پتھان چوکیدار حیران سا کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے فوراً پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا جہاں ایک لمحہ پہلے وہ شخص کھڑا تھا لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے حیرت سے اپنی آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں ٹٹولا لیکن وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔ چوکیدار ابھی تک میرے سر پر کھڑا شاید مجھے کوئی مخطوطہ لکھوا س بھڑ رہا تھا۔ وہ پھر ڈانٹنے کے انداز میں بولا۔ ”او بھائی تم کون ہے..... ایسے رات کو درختوں کے نیچے نہیں بیٹھنا چاہیے..... خوچہ یہ اچھا نہیں ہوتا مڑاں.....“ اب میں اُس کو کیا بتاتا کہ میری آدھی رُوح تو پہلے ہی نکل چکی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُس سے پوچھا ”کیا تم نے ابھی یہاں کسی اور شخص کو نہیں دیکھا..... وہ یہاں میرے قریب ہی کھڑا تھا۔“ چوکیدار نے حیرت سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ ”کون..... ادھر تو کوئی نہیں تھا۔ خوچہ ہم اسی لیے بولتا ہے کہ ایسے رات کے وقت ادھر اکیلا مت بیٹھو..... تم ادھر اکیلا بیٹھا تھا اور جب ہم ادھر آیا تو تم اپنے آپ کے ساتھ بولتا پڑا تھا.....“ گویا میں خود کلامی میں مشغول تھا۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ شاید کام کے دباؤ نے میرے دل و دماغ پر بھی گہرا اثر چھوڑا تھا اور اب میں جاگتی آنکھوں سے بھی خواب دیکھنے لگا تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا وہاں سے اُٹھا اور کسی طرح گرتے پڑتے رات گئے گھر تک پہنچ گیا۔ شکر ہے کہ سب لوگ سو چکے تھے۔ میں اس وقت اُن کے ساتھ کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے اور سر درد سے پھنا جا رہا تھا۔ میں چپ چاپ جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا اور آج کے تمام واقعات پھر سے میرے ذہن میں چلنے لگے۔ کیا واقعی وہ سب صرف میرا دھماکا تھا، یا.....؟ انہی سوچوں میں جانے کب مجھے نیند نے آگھیرا لیکن ابھی شاید میری آنکھ لگے ہوئے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ پھر سے وہی دوا نگارہ آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں، خود میرے ہی کمرے میں موجود دیوار میں لگی الماری جو چھت سے ذرا پہلے اپنی لمبائی ختم کرتی تھی، اُسی الماری پر وہ شخص بیٹھا مجھے گھور رہا ہے۔ ایک جھٹکے سے میری نیند ٹوٹی تو میں سینے میں شرا بور تھا لیکن الماری کے اوپر کوئی بھی نہیں بیٹھا تھا۔ میرے خدا..... یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کون سی بلا میرے پیچھے پڑ گئی تھی اور پھر اس جدید دور میں اگر کسی کو یہ سب بتاتا بھی تو وہ میرا مذاق ہی اڑاتا۔ میری بیوی ساتھ والے بستر پر پڑی خراٹے لے رہی تھی لیکن پھر میں دوبارہ سو نہیں پایا۔ ساری رات یہی آنکھ پھولی جاری رہی۔ میں جیسے ہی آنکھ بند کرتا، میری ہند آنکھوں کے پردے پر وہ ہولناک شبیر اُتر آتی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں منہ اندھیرے ہی گھر والوں کو سوتا چھوڑ کر دفتر جا پہنچا۔ ابھی تک خاکروب نے پوری طرح دفتر کو جھاڑ دہی نہیں لگایا تھا اور چہرہ اسی نے بھی اتنی صبح مجھے دفتر میں داخل ہوتے دیکھ کر حیرت سے اپنے کاندھے اُچکائے۔ لیکن اس وقت میری سمجھ میں اور کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں وہیں اپنی میز پر بیٹھا اپنے گھنٹیا براؤن کے سگریٹ پھونکتا رہا۔ دیر دیر سے لوگ دفتر آنا شروع ہو گئے اور جب میرا بار مرزا دفتر میں داخل ہوا تو مجھے اپنے سے پہلے دفتر میں پا کر وہ تو خوشی اور حیرت سے اُٹھل ہی پڑا۔ ”اے بارے صفر..... تو..... آج سورج کس طرف سے نکلا تھا..... میں نے تو غور ہی نہیں کیا.....“ میں نے فوراً مرزا کا ہاتھ پکڑا اور اُس کو ایک جانب لے جا کر کل شام کی ساری زوداد سنا دی۔ کچھ دیر تو وہ حیرت سے میری جانب دیکھتا رہا۔ پھر ایک اُس پر جیسے ہنسی کا دورہ ہی پڑ گیا ہو۔ بڑی مشکل سے وہ چپ ہوا ”میں نے تو سنا تھا کہ انسان ساتھ کے بعد



سٹپٹاتا ہے۔۔۔۔۔ تو تو چالیس کے بعد ہی۔۔۔۔۔ وہ پھر ہنسنے لگا۔ میں ناراض ہو کر پلٹ کر واپس جانے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”اے یار۔۔۔۔۔ ناراض کیوں ہوتا ہے۔۔۔۔۔ دراصل لوگوں کا دماغ دو شادیاں کر کے خراب ہوتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن تجھے تیری دونوں کریوں نے پاگل کر دیا ہے۔۔۔۔۔ یہ صرف ذہنی دباؤ اور ہر وقت کی سوچ کے کرشمے ہیں۔ میری جان۔۔۔۔۔ میں تو کہتا ہوں لعنت بھیج اس دوسری نوکری پر۔۔۔۔۔ جس دن سے تو نے اس خبیث عظیم کے دفتر میں نوکری کی ہے تیری پریشانیاں گھسنے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔۔۔۔۔ کیوں اپنی زندگی کو اتنے عذابوں میں ڈال رکھا ہے۔۔۔۔۔ جس گھر اور اولاد کے لیے تو قرض پر قرض لیتا رہتا ہے انہوں نے تو کبھی آج تک تجھے گھاس بھی نہیں ڈالی۔ پھر اپنے اُد پر ظلم کیوں کر رہا ہے۔“ مرزا کہہ تو ٹھیک ہی رہا تھا۔ ان دونوں کریوں اور قرض کے چکر میں میں خود گھن چکر بنتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن کیا وہ سب جو میرے ساتھ بیٹا صرف ایک خواب ہی تھا؟ اور کیا کوئی خواب اتنے لمبے تسلسل سے بھی دیکھا جاسکتا ہے؟ میرا دل اُسے ایک خواب ماننے پر راضی نہیں ہو پا رہا تھا۔ اسی ادھیڑ بئی میں سرکاری دفتر کا وقت ختم ہوا اور مجھے پھر سے اُسی اذیت گاہ کی جانب قدم بڑھانا پڑے جہاں روزانہ میری رُوح کا قتل ہوتا تھا۔ لیکن اُس دن اتفاق سے وہ جلا د عظیم دفتر کچھ دیر سے پہنچا اور آتے ہی اُسے کسی ضروری کام کے سلسلے میں دوبارہ باہر جانا پڑ گیا۔ میں اپنے اندر سرشام ہی ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ لہذا عظیم کے دفتر سے نکلنے کے بعد مجھ سے بھی دفتر میں نہیں بیٹھا گیا۔ میں دفتر سے نکلا اور میرے قدم خود بخود اُسی پارک کی جانب بڑھ گئے۔ مغرب کا وقت قریب ہی تھا اور بادلوں کی وجہ سے آج سرشام ہی اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ پتا نہیں میں اُس پارک کی جانب کیوں بڑھا چلا جا رہا تھا۔ شاید میں اُس الجھن اور اُس اذیت کو ختم کرنا چاہتا تھا جو اس خواب اور حقیقت کا جُج جاننے کے لیے میرا اندر اس وقت جھیل رہا تھا۔ جب میں پارک پہنچا تو ابھی وہاں اکا دکا لوگ موجود تھے جو شام ڈھلنے سے پہلے گھر واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ میں چپ چاپ جا کر اُسی بچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر چوکیدار کو اُس پاس نہ پا کر میں نے اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔۔۔۔۔ میں نے آنکھیں کھول کر پھر اطمینان کیا اور ایک بار پھر سر ہٹا کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اس بار بھی کوئی جھماکا نہیں ہوا۔ تو کیا واقعی وہ سب میرا وہم ہی تھا۔ میں نے تھک کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ کل جب میں یہاں آیا تو مغرب کے بعد کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ جب کہ اس وقت اچھی خاصی روشنی باقی تھی۔ میں نے اٹھتے اٹھتے گھر واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ جب یہاں تک آئی گیا ہوں تو آج اپنا شک پوری طرح دُور کر کے ہی واپس جاؤں گا۔ میں نے ٹہل کر پارک کا ایک چکر لگایا اور شاید وہ میرا تیسرا چکر تھا جب مغرب کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ میں چکر ختم کر کے واپس اپنے بچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ جانے میرا دل اتنے زور زور سے کیوں دھڑک رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک دو تین کہا اور آنکھیں بند کر لیں اور پوری طرح ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود میں ایک بار پھر اُٹھ چلا۔ ہاں۔۔۔۔۔ وہی دو سنگلی آنکھیں۔۔۔۔۔ میرے ذہن میں آواز گونجی ”مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔“ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور پھر ڈرتے ڈرتے بندکیں اور زیر لب جیسے اپنے آپ سے ہی پوچھا ”تم کون ہو۔۔۔۔۔؟ اور آخر میرے پیچھے ہی کیوں پڑے ہو۔۔۔۔۔ اور تم کسی اور کو کیوں نظر نہیں آتے۔“ وہ آنکھیں ہنس دیں۔ ”میں صرف اُسی کو نظر آتا ہوں جس کو نظر آنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ ورنہ تم انسانوں میں ایسے جنونی اور پاگل بھی موجود ہیں جو میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے اور مجھے پانے کے لیے برسوں جانے کتنی تپسیا اور کتنے جاپ کرتے ہیں۔۔۔۔۔ دن رات، صبح و شام اپنا جیون جلاتے ہیں۔ قبرستانوں میں، دریاؤں میں، صحراؤں میں ایک ناگ پر کھڑے ہو کر سالوں جنت منتظر

پڑھتے ہیں۔ قبروں سے مردے نکال کر ان کی ہڈیوں کا سرمہ بنا کر اپنی آنکھوں میں اس امید پر لگاتے ہیں کہ شاید وہ مجھے دیکھ پائیں گے لیکن جواب میں صرف اپنی بیٹائی ہی کھوتے ہیں عمر بھر کے لیے..... کئی تو ایسے بھی ہیں جو اپنے جیسے دوسرے انسانوں کا خون کرنے سے بھی نہیں چوکتے صرف اس امید پر کہ شاید وہ کبھی میری ایک جھلک ہی پالیں گے لیکن میں ان پر کبھی ظاہر نہیں ہوتا۔ میرا احسان مانو کہ میں کسی پریشانی، یا امتحان کے بغیر تم سے آج ٹھوکا ہوں.....“

مجھے اُس کی باتوں سے اُلجھن سی ہونے لگی تھی لہذا میں اپنی تلخی چھپا نہیں پایا۔ ”اچھا..... تو اب مجھ پر اس مہربانی کی وجہ بھی بتا ہی دو؟“

”بجہ کچھ خاص نہیں ہے..... بس تم مجھے اچھے لگ گئے ہو..... مجھ سے دوستی کرو گے.....؟“ ”دوستی.....؟ تم سے..... لیکن تم ہو کیا بلا..... میرا مطلب ہے تم کون سی مخلوق ہو.....؟“ وہ میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ”میں جس سے بگڑ جاؤں اُس کے لیے واقعی ایک بلا ہوں لیکن جس پر مہربان ہو جاؤں اُس کی دنیا بدل دیتا ہوں۔ تمہاری دنیا والے مجھے چھلاؤ کہتے ہیں۔“ میں اُس کی بات سن کر اُچھل پڑا۔ ”چھلاؤ..... تو کیا تم کوئی جن بھوت وغیرہ ہو۔“ وہ پھر ہنسا۔ ”تم چاہو تو بھوت ہی سمجھ لو..... لیکن کیا تم نے آج تک کوئی بھوت دیکھا بھی ہے؟ جنات کا وجود تو پھر بھی ثابت ہے، ورنہ تم انسان ہی خود سب سے بڑے بھوت ہو.....“ میں ابھی تک اُلجھن میں تھا۔ ”کیا تم سامنے آ کر مجھ سے بات نہیں کر سکتے.....؟ مجھے یوں بند آنکھوں سے بات کرنے سے اُلجھن ہونے لگی ہے۔“ ”ٹھیک ہے لیکن یاد رہے کہ میں صرف تم پر ہی خود کو واضح کر رہا ہوں۔ دوسروں کے لیے میں اب بھی اوجھل ہوں۔ اب تم چاہو تو آنکھیں کھول سکتے ہو۔“ میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ وہ بالکل میرے سامنے بچوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے ڈر کر اپنے پیرسکیٹر لیے۔ اُس کے بیٹھے کا انداز بھی عجیب تھا جیسے کوئی بلی کوئی اونچی چھلانگ لگانے سے پہلے اپنے پیروں پر اپنا پورا بوجھ ڈالتی ہے اور اگلے بچوں کو زمین پر نکا کر اپنا جسم تولتی ہے۔ وہ بھی یوں ہی زمین پر اپنا پورا وزن اپنے پیروں پر اور دونوں ہاتھ زمین پر نکا کر اور ہاتھوں کے پنجے کھولے ہوئے یوں بیٹھا تھا جیسے ابھی اگلے ہی پل کسی پھر تیلے چیتے کی طرح کوئی اونچی زق زق کر درخت کی کسی اونچی شاخ پر جا بیٹھے گا۔ اُس کے وجود میں جیسے کوئی پارا سا بھرا ہوا تھا، اور نُس نُس سے بے چینی پک رہی تھی۔ اُس نے غور سے میری طرف دیکھا لیکن نہ جانے کیوں میں اُس کی جانب دیکھ بھی نہیں پارہا تھا۔ ”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ تم مجھ سے دوستی کرو گے، یا نہیں.....؟ لیکن کوئی بھی جواب دینے سے پہلے میں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری دوستی اتنی آسان نہیں ہے۔ کچھ شرائط پر پورا اُترنا پڑتا ہے۔ ہاں البتہ اس کے بعد جب تم میرے دوست بن جاؤ گے تو دنیا کی ہر آسائش وہ سب کچھ جس کا تصور تم شاید اپنے آخری خواب میں بھی نہیں کر سکتے، وہ سب تمہارے قدموں میں ہوگا۔ بس صرف تمہاری خواہش دل سے ہونٹوں پر آنے کی دیر ہوگی اور اس جہاں کی ہر نعمت تمہارے اختیار میں ہوگی.....“

”اچھا.....؟..... تو اب لگے ہاتھوں وہ شرائط بھی بتا دو جو تم سے دوستی کرنے کے لیے مجھے پوری کرنا ہوگی۔“

”شرط کوئی خاص بڑی نہیں ہے..... بس تمہیں اپنا، ایمان، مجھے سونپنا ہوگا۔“

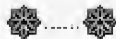
میں اُس کی بات سن کر اُچھل ہی تو پڑا۔ ”کیا مطلب.....؟..... تم کہنا کیا چاہتے ہو.....؟“ اُس نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”تم سمجھ نہیں، یا پھر سمجھنا نہیں چاہتے..... میں نے کوئی اتنی مشکل بات تو نہیں کہی؟ بس تمہیں اپنا مذہب ترک کرنا ہوگا۔ تم مسلمان ہونے کے باوجود اپنے



مذہب کا کوئی بھی فرض رکن ادا نہیں کرو گے۔ کبھی مسجد میں قدم نہیں رکھو گے۔ کلمہ، نماز، روزہ یہ سب تمہارے لیے میری دوستی کے بعد اجنبی ہو جائیں گے۔ بس اتنی سی شرط ہے تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں.....“

غصے میں میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ”واہ..... کیا شرط ہے.....؟ تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری باتوں میں آکر اپنا مذہب ترک کر دوں گا..... کبھی نہیں..... میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی دوستی پر..... دوبارہ کبھی میرے راستے میں نہ آنا۔“ وہ زور سے ہنسا ”تم اتنا بھڑک کیوں رہے ہو..... میں نے جو عمل تمہیں ترک کرنے کے لیے کہا ہے تم خود نہ جانے کب کا وہ سب کچھ چھوڑ چکے ہو..... ذرا غور تو کرو..... تم نے آخری نماز کب پڑھی تھی.....؟ تمہیں روزہ رکھے ہوئے کتنے سال ہو چکے ہیں.....؟ اور آخری بار تم نے کسی مسجد کا دروازہ کب پار کیا تھا.....؟ تم اور تمہارا پورا گھر اتنا تو عید کے دن بھی سورج چڑھے نیند سے جاگتا ہے..... تمہاری مذہبی کتاب کچھلے سات آٹھ سالوں سے تمہارے گھر کے طاق میں پڑی پڑی مٹی سے اٹ چکی ہے..... میں نے اُسکی کون سی انہونی کہہ دی ہے جو تم یوں مجھ سے اٹھ رہے ہو.....؟“ میں اُس کی باتیں سن کر مزید غصے اور خجالت کا شکار ہو گیا۔ بہر حال اُس نے کہا سب سچ ہی تھا۔ ”تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟ اور کان کھول کر سن لو کہ نماز پڑھنا نا پڑھنا میرا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں اپنا ایمان ہی تمہاری دوستی کے عوض بیچ ڈالوں۔“

وہ ایک لمحہ پہلے مجھے زمین پر دکھائی دیا لیکن اب اگلے ہی لمحے وہ درخت کی پہلی شاخ سے ٹنگا ہوا دکھائی دیا۔ وہ مسلسل بات چیت کے دوران ہر لمحہ اپنی جگہ بدلتا ہی رہتا تھا۔ جیسے اُسے کسی کروٹ بھی چمین نہ ہو۔ میری بات سن کر وہ غصے میں آ گیا۔ ”کسی نے سچ ہی کہا تھا..... تم انسان ہو ہی سدا کے ناشکرے۔ ٹھیک ہے جاؤ مرو اُسی ذلت کی زندگی میں۔ جہاں صبح سے شام تک تمہیں صرف بے عزتی ہی ملتی ہے..... جس سے کل تک تم اتنے بے زار آچکے تھے کہ یہیں اس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر مرنے کے طریقے سوچ رہے تھے۔ تم جیسوں کو مری جانا چاہیے۔ میں تمہیں آج جانے دے رہا ہوں، لیکن یاد رہے کہ اب اس طرف کا رخ بھی کرنا جب تم میری دوستی قبول کرنے کا فیصلہ کر لو، ورنہ اگر تمہیں میں نے دوبارہ تمہارے اس برائے نام ایمان کے ساتھ اپنے اس ٹھکانے کے آس پاس بھی بھٹکتے ہوئے دیکھا تو میں خود تمہاری جان لے لوں گا۔ تم نے ابھی تک میری دوستی دیکھی ہے..... میرا جان لیوا روپ نہیں دیکھا..... جاؤ اب یہاں سے.....“ وہ پل بھر میں جانے کہاں غائب ہو چکا تھا لیکن اُس کے لہجے نے واقعی مجھے ڈرا دیا تھا۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا تو چوکیدار دُور سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا مجھے اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ میں اُس کے سوالات سے بچنے کے لیے جلدی سے وہاں سے اٹھا اور مخالف سمت چلتا ہوا پارک سے باہر نکل گیا۔



## ایمان فروش

اصغر صاحب کی داستان ابھی نہیں تک پہنچی تھی کہ صبح کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ میں کچھ اس طرح سے اُن کی کہانی میں مگن ہو گیا تھا کہ وقت گزرنے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔ ہمیں وقفہ لینا پڑا۔ حالانکہ یہ خاصا مشکل کام تھا۔ میں نے اصغر صاحب کو کچھ آرام کرنے کا کہا لیکن خود میرا پورا دن اُن کی کہانی کے تانوں بانوں میں الجھا رہا۔ خدا خدا کر کے دن ڈھلا اور رات کو پھر ہمیں تنہائی میسر آئی تو اصغر صاحب نے پھر سے اپنی کہانی کا سراویں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

”عبداللہ میاں..... انسان بڑا کمزور ہے۔ وہ ارادے باندھتا ہے اور پھر توڑ دیتا ہے۔ میرے ارادوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا..... میں اُس روز چھلاؤے کو دھتکار تو آیا لیکن اگلے ہی روز صبح ہی سے میری پریشانیوں کا وہی پرانا نہ ختم ہونے والا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔ وہی سرکاری دفتر اور وہی افسروں کی جھج جھج صبح سویرے ہی سب سے پہلے بیوی نے فلیٹ کے کرائے کا روٹنا شروع کر دیا کہ مالک کئی مہینوں سے کرایہ بڑھانا چاہتا ہے اور کل شام کو اُس نے فائل نوٹس بھی دے دیا ہے کہ کرائے میں ساڑھے تین ہزار کا اضافہ کرو ورنہ فلیٹ چھوڑو..... اور ہمارے پاس وقت بھی صرف دو ہفتوں کا ہی بچا تھا۔ بیوی سے لڑ کر اور جان چھڑا کر دفتر پہنچا تو وہاں بھی افسر اکھڑے ہوئے تھے کہ ہفتوں پرانی فائلز ابھی تک میری میز پر کیوں پڑی ہیں.....؟ وہاں سے ڈانٹ کھا کر عظیم کے دفتر پہنچا تو وہ پہلے ہی گزشتہ دن میرے دفتر سے جلدی اٹھ جانے کا پتا چل جانے پر غصے میں آگ بگولہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور فائل اٹھا کر میرے منہ پر دے ماری اور مجھے آفس سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ مطلب یہ نوکری بھی میرے ہاتھ سے جا چکی تھی۔ دفتر سے باہر نکلا تو گھر واپسی کا سوچ کر ہی میرا دل اُلٹنے لگا کہ جب میری بیوی کو پتا چلے گا کہ میں کرائے کا انتظام کرنے کے بجائے اُلٹا اپنی لگی بندھی نوکری بھی گنوا آیا ہوں تو وہ تو آسمان سر پر اٹھالے گی۔ میں نے پی سی او سے دو چار دوستوں کو فون کیا کہ شاید کچھ قرض کا انتظام ہو جائے مگر میں پہلے ہی سب سے اتنا قرض لے چکا تھا کہ اب تو کئی دوست میری آواز سن کر ہی فون بند کر دیتے تھے۔ چھلاؤے نے ٹھیک ہی کہا تھا مجھ جیسوں کو تو مری جانا چاہیے تھا۔ میں نے کچھ سوچا اور قدم بڑھا دیئے اور جب میں اپنے خیالات کی یلغار سے چونکا تو میں پھر وہی اُسی پارک میں اُسی درخت کے نیچے کھڑا تھا اور شام کا ملگجاندہیرا میری قسمت کی کالک کی طرح آس پاس پھیل چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے درخت کے پیچھے سے جھانکا۔

”تم پھر آگئے..... میں نے تمہیں خبردار بھی کیا تھا کہ.....“

”ہاں..... میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے مار ڈالو..... مجھ میں خود کو مارنے کی ہمت نہیں ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”بڑے بزدل ہو..... خود مر بھی نہیں سکتے..... اور مر کے بھی جین نہ پایا تو کدھر جاؤ گے.....؟“



میں نے بے بسی سے سر جھکا ”ٹھیک ہے..... تم بھی اڑو مذاق..... میری اپنی دنیا والے بھی یہی کرتے ہیں.....“

”میری پیش کش اب بھی قائم ہے..... جس مذہب سے تم پہلے ہی ملیوں دُور ہو..... اُسے میری خاطر ترک کرنے میں آخر تمہیں اعتراض ہی کیا ہے؟ اچھا چلو..... میں تمہاری خاطر اپنی شرط میں کچھ نرمی پیدا کر دیتا ہوں لیکن صرف تمہارے لیے..... کیا سمجھے..... تم چاہو تو صرف ایک سال کے لیے آزمائشی طور پر اپنا ایمان میرے پاس گروی رکھوا سکتے ہو۔ اگر سال کے بعد تمہیں لگے کہ تمہاری پرانی زندگی ہی بہتر تھی تو تم واپس لوٹ جانا۔ لیکن خیال رہے کہ اس ایک سالہ معاہدے میں ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ہر بات ماننا ہوگی۔ جو تم کہو گے وہ میں کروں گا اور جس چیز سے میں تمہیں منع کروں گا تمہیں اُس سے پلٹنا ہوگا۔ بولو منظور ہے۔“ میں ابھی تک اسی ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ ”لیکن..... میرا مطلب ہے کہ اگر کسی غلطی، یا مجبوری کی وجہ سے میں نے مذہب کا کوئی ایسا رکن اختیار کر لیا تو کیا ہوگا..... کیا اُس کے بعد.....“ اُس نے میری بات کاٹ دی، ”اُس کی تم فکر نہ کرو..... جب تم ایک بار سچے دل سے اپنا ایمان میرے پاس گروی رکھوادو گے تو پھر سال بھر تمہارے دل میں ایسی کوئی بات اول تو پیدا ہوگی نہیں..... اور پھر اگر تمہارا دل ’بھٹکا‘ بھی تو میرے پاس اس کا انتظام بھی موجود ہے۔ تم یہ سرخ دھاگا اپنے گلے میں باندھ لو..... یہ پورے ایک سال تک تمہارے گلے میں موجود رہے گا اور تمہیں ہر اس بات سے بچائے گا جو مجھے پسند نہیں ہے، یا جس سے ہماری دوستی کی کسی بھی شرط پر کوئی بھی آٹھ آسکتی ہو۔ یوں سمجھ لو کہ یہی سرخ دھاگا میرے اور تمہارے رابطے اور معاہدے کا ضامن ہوگا۔“ میں نے سر جھٹک کر دیکھا تو دھاگا اب اُس کے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ میں شدید ہچکچاہٹ اور کش مکش کا شکار تھا۔ اُس نے مجھے اکسایا۔ ”سوچو مت..... ایسے موقعے زندگی میں بار بار نہیں ملتے..... تمہیں کون سا دین، یا دنیا میں سے کوئی ایک بھی میسر ہے..... دین کی طرف تم گئے نہیں اور دنیا تم سے بھاگتی رہی..... اب ایک موقع ملا ہے تو کم از کم اس زندگی کو ہی جی جاؤ..... صرف ایک سال ہی کی تو بات ہے۔ پھر عمر بڑی ہے دین کو بچنے کے لیے..... باندھ لو دھاگا..... لوگ ایسی زندگی کا ایک پل جینے کے لیے عمر بھر بڑیاں رگڑتے ہیں..... اور میں تمہیں پورا ایک سال دے رہا ہوں..... باندھ لو یہ دھاگا..... دیر مت کرو.....“

میرے ذہن میں جیسے اک ساتھ کئی جھکڑ چل رہے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس لی، آنکھیں بند کیں اور دھاگا گلے میں ڈال کر اس کی ڈور کس لی۔ دفعۃً ایک زوردار آندھی چلی۔ مجھے یوں لگا یہ ہوا اس درخت کی شاخیں مجھ پر گرا کر ہی دم لے گی۔ گرد کا ایک طوفان اُٹھا، مجھے ایک تیز چکر آیا اور میں لہرا کر وہیں زمین پر گر گیا۔

دوبارہ مجھے تب ہوش آیا جب کوئی دھیرے دھیرے پیار سے میرا کاندھا ہلا کر مجھے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”اٹھ جا کمین نا..... دیکھیں کتنی دیر ہو گئی ہے..... آج دفتر نہیں جانا کیا.....؟“ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میری جھکڑ والو اور لڑاکا بیوی نہایت تیز اور پیار سے مجھے جگا رہی تھی اور اُس کے ہاتھ میں گرم چائے کا ایک کپ بھی تھا..... ادو، بیڈ ٹی (Bed Tea)..... میں نے جلدی جلدی زور سے اپنی آنکھوں کو رگڑا..... میں نے پہلے کوئی خواب دیکھا تھا، یا ابھی اس وقت کوئی سنا دیکھ رہا تھا۔ میں حیرت سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے پیار سے میرے بال سہلائے اور نکیہ سیدھا کر کے مجھے بٹھایا اور چائے کا کپ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ”آپ کس سوچ میں پڑے ہیں..... جلدی کریں..... میں آپ کے کپڑے استری کر کے ہاتھ روم میں لٹکا دیتی ہوں۔ جلدی سے چائے پی کر نہ لیں۔ پانی گرم کروا دیا ہے.....“ میری بیوی کمرے سے مسکراتی ہوئی

نکل گئی۔ اُس کی یہ مسکراہٹ میں نے آج سے ٹھیک ۲۵ سال پہلے دیکھی تھی جب ہماری تازہ تازہ شادی ہوئی تھی۔ تب سے لے کر آج تک میں اُس کی مسکراہٹ تو دُور، اُس کے دو ٹپھے بولوں کو بھی ترس گیا تھا۔ بیوی کے نکلتے وقت میری نظر ڈرائنگ ٹیبل کے آئینے پر پڑی تو اس میں مجھے پیچھے اپنی الماری کے اوپر وہ بیٹھا مسکراتا ہوا نظر آیا۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ میں نے ایک خواب کے سے عالم میں چائے ختم کی اور کمرے سے باہر نکلا تو میری بیٹی تولیہ اور صابن اور دوسری بیٹی ہاتھ میں میرے استری شدہ کپڑے پکڑی نظر آئی ”ابا آپ جلدی سے نہ لیں..... پھر ہم سب اکٹھے ناشتا کریں گے۔ آج عظمیٰ نے اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے پراٹھے بنائے ہیں۔“ عظمیٰ میری چھوٹی بیٹی کا نام تھا۔ میں حیرت سے وہیں گر پڑنے کے قریب تھا۔ اسی کیفیت میں غسل کر کے باہر نکلا تو میرا بڑا بیٹا وقار میرے جوتے پالش کر چکنے کے بعد انہیں کپڑے سے چکار رہا تھا۔ جب کہ چھوٹا میرے لیے خشک سلپر لیے پہلے سے میرے انتظار میں غسل خانے کے باہر کھڑا تھا۔ میری تو جیسے زبان ہی کنگ ہو چلی تھی۔ میری بیوی اور بیٹیوں نے جس پیار سے مجھے ناشتا کروایا اور بیٹوں نے جس محبت سے لُچ بکس کا لٹن کیرئیر میرے حوالے کر کے مجھے دفتر کے لیے رخصت کیا وہاں میں نے خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ فلیٹ سے نکل کر بس اسٹاپ پر پہنچا تو جیسے بس میرے انتظار میں ہی کھڑی تھی اور میری پسندیدہ تین نمبر کی کھڑکی والی سیٹ بھی خالی تھی، جہاں بیٹھ کر میں ڈرائیور سے کہہ کر اپنی پسندیدہ کیسٹ بھی سن سکتا تھا۔ آج خلاف توقع کنڈیکٹر کا رویہ بھی میرے ساتھ بہت اچھا تھا اور جانے کیوں مجھے یہ بھی محسوس ہوا ہل بھر کے لیے کہ میں نے ڈرائیور کے سامنے لگے ہوئے بیک ویو مرر میں اپنے اُسی مہربان کی ایک جھلک بھی دیکھی ہے لیکن جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو پچھلی سیٹ پر کوئی اور بیٹھا ہوا تھا۔

دفتر پہنچا تو چڑا سی نے نہایت ادب سے سلام کیا اور بتایا کہ تو صیف صاحب دو تین بار میرا پوچھ چکے ہیں۔ تو صیف صاحب ہمارے سیکشن آفیسر تھے اور اصولوں اور وقت کے نہایت پابند۔ میں نے جھجکتے ہوئے اُن کے کمرے میں قدم رکھا تو مجھے دیکھتے ہی بولے ”آئیے آئیے اصغر صاحب.....“۔ بھئی مبارک ہو..... آپ کو سپرنٹنڈنٹ پر موٹ کر دیا گیا ہے اور وہ جو ہاؤس لون (House Loan) کے لیے آپ نے درخواست دے رکھی تھی، وہ قرضہ بھی منظور ہو گیا ہے۔ کیشیئر سے اپنا چیک لیتے جائیے گا.....“ حیرت اور خوشی کے مارے میری آواز بند ہو گئی۔ میری پروموشن کا کیس پچھلے پانچ سالوں سے الٹا ہوا تھا۔ کیوں کہ میری اے سی آر (ACRs) ٹھیک نہیں تھیں اور یہ گھر کے لیے اس قرضے کی درخواست تو میں نے بھرتی کے دوسرے سال سے دے رکھی تھی اور اب تو میں اُسے بھول بھی چکا تھا۔ میں شادی مرگ کی کیفیت میں تو صیف صاحب کے کمرے سے نکلا تو وہ مجھے میری میز کے اوپر اکڑوں بیٹھا نظر آیا۔ ”کیوں..... اب تو خوش ہو.....“..... ”خوش.....؟ ہاں مگر یہ سب.....؟ کیسے.....؟“ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ جو تم سوچو گے وہ ہو جائے گا..... صبح سے اب تک صرف وہی ہو رہا ہے جس کے بارے میں تم برسوں سے سوچتے آرہے ہو..... تم نے آج تک ہمیشہ یہی سوچا تھا نا کہ تمہارے گھر میں تمہاری عزت ہو، آرام اور سکون ہو..... اور تمہاری وہ سب چھوٹی چھوٹی سی خواہشیں پوری ہوں جن کے لیے تم برسوں سے ترس رہے ہو.....؟..... تو بس میں نے صرف تمہاری آج تک کی اُن خواہشوں کو ہی پایہ تکمیل پہنچایا ہے..... ویسے تم انسان بھی بڑے عجیب ہوتے ہو..... تم نے ان معمولی اور گھٹیا سی خواہشوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اپنی ساری عمر گنوا دی..... یہ معمولی سا ہاؤس لون اور اس سپرنٹنڈنٹ کی یہ بڑے کلرکوں والی نوکری..... بس یہی پہنچ تھی تمہاری آج تک کی ہر سوچ ہر جذبے کی..... سچ یو چھو تو مجھے افسوس ہو رہا ہے تمہارے معیار پر.....“



میں حیرت سے بیٹھا اُس کی باتیں سنتا رہا۔ اس وقت دفتر میں کچھ زیادہ چہل پہل نہیں تھی کیوں کہ باقی سارے لوگ کانفرنس ہال میں تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں پٹ پٹائیں۔ ”مطلب یہ کہ میں جو بھی سوچوں گا تم میرے لیے دیباہی کر دکھاؤ گے۔۔۔۔۔؟ کچھ بھی۔۔۔۔۔ جو بھی میرے دل میں آئے؟“ وہ مسکرایا ”آزمائش شرط ہے۔۔۔۔۔“ اور پھر میں نے آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ شام کو جب میں عظیم کے دفتر پہنچا تو میرے دل نے کہا ”عظیم میرے لیے دروازہ کھولے۔۔۔۔۔“ اور پھر دروازہ کھلا تو عظیم میرے سامنے فائیکس لیے کھڑا تھا۔ اُس نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا ”آئیں سر پلیز۔۔۔۔۔ ہم آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے۔۔۔۔۔“ شبانہ بھی اُس کے پہلو میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں شدید خواہش کے باوجود کچھ ڈگمگا سا گیا۔ اُس نے میرے ذہن کو دھیرے سے کھٹکھٹایا۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ اس وقت یہ تمہارا نہیں۔۔۔۔۔ تم اس کے پاس ہو۔۔۔۔۔ جو دل میں بھڑاس بھری ہے۔۔۔۔۔ سب نکال دو۔۔۔۔۔“ میں پھر سے خود اعتماد ہو گیا اور عظیم کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے اُس سے کام کے بارے میں پوچھا۔ شبانہ میری کرسی کے پیچھے ہی کھڑی تھی، بالکل ویسے ہی جیسے وہ عظیم کے ساتھ کھڑی ہوتی تھی۔ عظیم نے جلدی سے فائل میرے سامنے پیش کی۔ میں نے دو صفحے پلٹے اور پھر فائل اٹھا کر پوری قوت سے عظیم کے منہ پر دے ماری۔ ”یہ کام کرتے ہو تم۔۔۔۔۔ آج تک تمہیں ٹھیک طرح سے ڈرافٹنگ کرنا بھی نہیں آئی۔ بوڑھے گدھے ہو گئے ہو اور ابھی تک غلطیاں کرتے رہتے ہو۔“ عظیم کے ماتھے سے ویسے ہی پسینہ ٹپ رہا تھا جیسے روزانہ میرے ماتھے سے ٹپکتا تھا۔ شبانہ ویسی ہی مسکراہٹ لبوں پر سجائے ہوئے کھڑی طنز سے عظیم کی جانب دیکھ رہی تھی۔ میں پھر عظیم پر دھاڑا ”چلو اٹھاؤ یہ فائل اور اپنی منہوس صورت میری نظروں کے سامنے سے دور لے جاؤ۔ دوبارہ اس طرح کا ڈرافٹ میرے سامنے لے کر آئے تو میں فائل سمیت تم کو بھی اس کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔ دفع ہو جاؤ۔۔۔۔۔“ عظیم خجالت اور شرمندگی سے کانپتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ شبانہ مسکراتی ہوئی میری آغوش کی جانب بڑھی لیکن اب اُس کی باری تھی۔ میں زور سے چیخا۔ ”اور یہ تم کیا ہر وقت اپنے ہونٹوں پر طوائفوں جیسی نمائشی مسکراہٹ سجائے میرے آگے پیچھے پھرتی رہتی ہو۔ مجھے اپنے دفتر میں کام چاہیے۔۔۔۔۔ بازار نہیں۔۔۔۔۔ تم بھی دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں بھی ابھی اسی وقت دھکے مار کر دفتر سے نکلوا دوں گا۔“ شبانہ کا رنگ ہی جیسے اڑ گیا اور وہ چند لمحوں میں حیرت اور صدمے میں لنگ سی کھڑی رہ گئی اور پھر روتے ہوئے دوڑ کر دروازہ کھول کر باہر بھاگ گئی۔ میرے اندر برسوں کے اُلتے ہوئے لاوے پر جیسے کسی نے پورا ٹھنڈا اور یا انڈیل دیا ہو۔ اتنا سکون میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں عظیم کے کمرے سے باہر نکلا تو سارے دفتر کے لوگ حیرت میں شاک زدہ سے کھڑے تھے اور یہ سارا ماجرا انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ وہی سب لوگ تھے جن کے سامنے میں برسوں سے ذلیل ہو رہا تھا اور آج انہوں نے مجھے اپنے اندر کا لاوا اُن لوگوں پر اُلتے ہوئے دیکھ لیا تھا جن سے وہ اندر ہی اندر شاید خود بھی شدید نفرت کرتے تھے لیکن خوف اور مجبوری کی وجہ سے کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ میں نے ہال سے نکلتے ہوئے سب کو الوداعی سلام کیا تو سب سے پہلے رؤف کے ہاتھ تالی بجانے کے لیے اٹھے اور پھر دھیرے دھیرے اُن سب کی تالیوں سے ہال گونجنے لگا۔ میں مسکراتے ہوئے دفتر سے باہر نکلا تو میں نے دھیرے سے خود سے سرگوشی کی ”تم نے یہ سب کیسے کیا۔۔۔۔۔؟ میرا مطلب ہے عظیم میرے سامنے یوں بھگی بلی بنا کیسے کھڑا تھا؟ آخر وہ ہے تو میرا پاس ہی۔۔۔۔۔“

وہ مسکرایا ”تم ان باتوں میں اپنا ذہن مت الجھاؤ۔۔۔۔۔ یہ میرے بانیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بہر حال فی الحال تم نئے نئے میرے دوست بنے

ہو تو یوں سمجھ لو کہ یہ سب نظر بندی کا کھیل تھا۔ عظیم نے تمہیں اپنے ہی کسی بڑے افسر کے روپ میں دیکھا۔ تمہارے دفتر سے نکلنے کے بعد اُسے رفتہ رفتہ یہ احساس ہوگا کہ اُسے ذلیل کرنے والے خود تم تھے۔ بہر حال اب تم کچھ بڑا سوچو..... پورا دن گزر گیا یہ چوہے بلی کا کھیل کھیلتے ہوئے..... میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا ”بڑا سوچو.....؟..... کیا مطلب.....“ ”مطلب یہ کہ سب سے پہلے تمہیں اس پھنچر فلیٹ سے نکال کر تمہارے لیے اپنے دوست کے ہم منصب زندگی کا سوچنا ہوگا۔ آخراً تم میرے دوست ہو، کوئی معمولی انسان نہیں..... لیکن تم انسانوں کی مجبوریاں بھی دھیان میں رکھنا پڑتی ہیں۔ بہر حال یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو.....“

اور پھر میں نے واقعی سب اُسی پر چھوڑ دیا۔ اگلے تین دن کے اندر نہ جانے میرے برسوں پرانے خریدے گئے چند پرانے ہانڈ ز اور حال ہی میں خریدا گیا لارری کا ایک ٹکٹ کیے بعد دیگرے یوں نکلے کے اگلے ایک مہینے کے اندر میں پہلے لکھ پتی اور پھر اگلے چند مہینوں میں کروڑ پتی ہو چکا تھا۔ دولت مجھ پر یوں برس رہی تھی جیسے میں نے کوئی پارس پالیا ہو اور میں جس چیز کو بھی ہاتھ لگا تا دہ سونے کی بن جاتی۔ چھ مہینے کے اندر اندر میری زندگی یکسر بدل چکی تھی اور ان چھ مہینوں میں اس چھلاوے نے خود مجھ سے کوئی خاص کام بھی نہیں لیا تھا سوائے ایک آدھ بار کسی ویرانے سے چند جٹے ہوئے بال اٹھا کر کسی گھر کے آنگن میں ڈال آنے کے، یا پھر کسی جانور کا گوشت کسی ایک جگہ سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ پھینک آنا، وغیرہ وغیرہ۔ سچ پوچھو تو مجھے وہ سب کام انتہائی اچھا لگتے تھے۔ لیکن میں نے سوچا کہ ہوگا کوئی جادوؤ نے کا چکر لہذا میں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ ہاں البتہ اس تمام عرصے میں، میں دین سے بالکل دُور رہا اور خود دین رفتہ رفتہ میرے گھر سے دُور ہوتا گیا۔ اس کا اندازہ پہلی بار مجھے چھ مہینے کے بعد اُس وقت ہوا جب ایک شام میں تھکا ہارا اپنے آفس سے گھر پہنچا۔ میرا کاروبار اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ مجھے اپنے اور اپنے دو بیٹوں کے الگ الگ تین عظیم الشان دفاتر قائم کرنا پڑے تھے۔ ہم نے اپنے کاروبار کے لیے ایک بڑی عمارت خرید لی تھی۔ اور میں، میرے بیٹے اور اُن کا سارا اسٹاف اسی عمارت میں بیٹھتا تھا۔ ہمارا زمینوں کی خرید و فروخت کا کاروبار تھا اور ہم شہر کے سب سے بڑے بلڈر کہلاتے تھے۔ ہم تینوں اپنی اپنی بڑی گاڑیوں میں صبح گھر سے نکلے اور شام تک ہم آدھا شہر فتح کر کے گھر واپس لوٹتے تو عام طور پر گھر سنسان ملتا تھا اور نوکروں سے پتا چلتا کہ بیگم صاحبہ کسی تقریب پر گئی ہوئی ہیں اور چھوٹی بیبیاں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھومنے کے لیے گئی ہوئی ہیں۔ البتہ اُس شام میں گھر پہنچا تو میں نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔ میری بیوی کی کلب والی تمام نئی سہلیاں میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھیں اور اُن کے سامنے میز پر تاش کے پتوں اور بیسیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ فلیش چل رہا تھا اور کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے اُس دن پتا چلا کہ میری بیوی نے سگریٹ پینا بھی شروع کر دیا ہے۔ ابھی میں حیرت کے اس پہلے جھٹکے سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ میں نے کھڑکی سے باہر چھوٹی عظیمی کو شہر کے ایک مشہور لوفا میرزاوے کی گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھا اور جس انداز میں وہ اُس سے گٹھل کر رخصت ہوئی وہ مجھے شرم سے پانی پانی کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے اُس وقت تو کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پائے رکھا لیکن رات کو جب میں نے بیوی سے گھر کو جو خانہ بنانے اور بیٹی کی آزاد خیالی پر استفسار کیا تو اُس نے لا پرواہی سے اٹھلا کر کہا ”اوہ کم آن اصغر..... کیا ہو گیا ہے آپ کو..... آپ محلوں تک پہنچنے کے باوجود ابھی تک ذہنی طور پر اُسی دو کمرے کے فلیٹ میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس سوسائٹی میں سو (Move) کرنے کے لیے یہ سبھی طور طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔ اور رہی بات عظیمی اور شہزاد کی تو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ لڑکے کے گھر والے چند روز میں عظیمی کا رشتہ لینے آرہے ہیں۔“ میں نے تلملا کر کہا ”بات رشتہ لینے دینے تک پہنچ چکی ہے اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی۔ تم جانتی بھی ہو



اس لڑکے کو..... ایک نمبر کا غنڈہ ہے..... امیر زادہ ہوا تو کیا ہوا۔“ میری بیوی نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں۔“ کیا ہو گیا ہے آپ کو..... اس معاشرے میں لڑکی کا رشتہ دیتے وقت صرف لڑکے کی حیثیت اور بینک بیلنس دیکھا جاتا ہے۔ چلیں اب سو جائیں۔ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔“ میری بیوی تو کروٹ بدل کر چند لمحوں میں خراٹے بھرنے لگی لیکن میری نیندیں اسی روز حرام ہو چکی تھیں۔ میں نے چھلاوے سے اس بارے میں شکایت کی تو وہ بھی طنزیہ ہنسی منس دیا۔ ”تمہاری بیوی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ تم کبھی بڑے آدمی نہیں بن سکتے۔ ہمیشہ چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں الجھے رہتے ہو۔ یہی جو اگر تمہاری بیوی شہر کے کسی بڑے جم خانے، یا آفیسر کلب نما جگہ پر کھیلتی تو تم اسے نئی تہذیب میں شار کرتے اور اگر وہی تاش کے پتے گھر میں کھل گئے تو وہ جوا ہو گیا؟ اور شکر کر تمہاری بیٹی نے اُس لڑکے کو گھر رشتہ لانے کا کہا ہے۔ ورنہ جس ماحول میں وہ پل بڑھ رہی ہے وہاں لڑکیاں یا تو بھاگ کر شادی کرتی ہیں، یا پھر باہر شادی رچا کر گھر واپس آتی ہیں۔ تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ ایک دم اور آسانی سے بے تحاشا پیسہ مل جانے کے اپنے بھی کچھ اثرات ہوتے ہیں..... اور پھر تم انسان ایک اور پابندی بھی تو خود پر لگائے رکھتے ہو فضول سی۔ وہ کیا کہتے ہیں اُسے، ہاں..... حلال اور حرام..... تو اصغر صاحب تمہارے گھر میں پانی کی طرح بہتا پیسہ بھی تو تمہارے انسانی معیار کے مطابق حرام کا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سارے کمالات اسی حرام کے پیسے سے کھائی ہوئی روٹی کے ہوں.....؟“ میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کی باتیں تلخ اور کڑوی تو کوئین سے بھی زیادہ ہوتی تھیں، لیکن سچ ہوتی تھیں۔ اگلے دن ایک اور بُری خبر میری منتظر تھی۔ میرا چھوٹا بیٹا کرکٹ پر کروڑوں کا سٹ کھیلتے ہوئے پکڑا گیا۔ گوروں کی کوئی ٹیم آئی تھی خاص اُسے پکڑنے کے لیے۔ چھلاوے کی مدد نہ ہوتی تو عمر بھر باہر کی جیلوں میں سڑتا رہتا۔ ابھی اس پریشانی سے باہر نہیں نکل پایا تھا کہ بڑی بیٹی نے نشے میں دھت حیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے کسی راہ گیر کو پکچل دیا۔ بیٹی کی ایف آئی آر میں نے جب پڑھا کہ اُس کے میڈیکل ٹیسٹ میں شراب کا نتیجہ مثبت آیا ہے تو میں بالکل ہی ڈھے گیا۔ آسانی سے ملا ہوا بے تحاشا اور حرام کا پیسہ واقعی اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ میں ایک شام اسی غم میں اداس سا اپنے دفتر میں بیٹھا ساحل کی طرف کھلتی کھڑکی سے دُور لنگر انداز جہازوں کو دیکھ رہا تھا کہ اُس کی آواز میرے من میں گونجی..... ”کیا بات ہے..... بہت اداس ہو..... اب تو زندگی کی ہر نعمت تمہارے پاس ہے..... اب اس اداسی کی وجہ کیا ہے..... میرے ہوتے ہوئے بھی میرا کوئی دوست اداس اور پریشان ہو تو پھر میرا کیا فائدہ.....“ میں نے ٹھنڈی سی آہ بھری ”پتا نہیں..... میرا دل اب ان سب چیزوں سے اُوب سا گیا ہے۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ غربت کے اپنے مسائل اور امارت کی اپنی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ لیکن دونوں صورتوں میں انسان کا مقدر صرف بے چینی ہی ہے..... سکون کہیں بھی میسر نہیں آتا۔“ اُس نے میرا دل بہلانے کی کوشش کی۔ ”اچھا چھوڑو یہ مایوسی کی باتیں۔ یہ بتاؤ کبھی کوئی عشق وغیرہ کیا ہے زندگی میں.....“ ”عشق.....؟..... کیوں دل جلاتے ہو..... تمہارے آنے سے پہلے کھانے کے بھی لالے پڑے ہوئے تھے..... ایسے میں عشق کسے سو جھ سکتا ہے؟“ اُس نے اصرار کیا ”پھر بھی..... شادی سے پہلے کبھی تو کوئی اچھی لگی ہوگی.....؟ کیا تمہارے پاس کوئی بھی سنہری یاد نہیں ہے.....؟“ میں ماضی کے دریچوں میں کھو گیا۔ ”ہاں کبھی تھی کوئی..... لیکن پھر وہی امارت اور غربت کی دیوار..... ہم یونیورسٹی فیلو تھے..... وہ بہت چاہتی تھی مجھے۔ لیکن جب اُس کے سیٹھ باپ کو پتا چلا تو اُس نے اپنے کارندوں کے ذریعے میری وہ خبر لی کہ یاد رہے اور مجھے دھمکی بھی دی کہ اگر میں اُس کی بیٹی کے آس پاس بھی پھنکا تو میری خیر نہیں۔ بعد میں سنا ہے اُس کی کسی بڑے صنعت کار کے ساتھ شادی ہو گئی تھی..... اب تو نہ جانے وہ کہاں ہوگی.....“ اُس وقت تو چھلاوہ چپ رہا لیکن صبح میرے دفتر کے دروازے پر کسی نے ہلکی سی دنگ دی۔ میرے اسٹاف میں سے کسی

میں جرأت نہیں تھی کہ یوں ”ڈونٹ ڈسٹرب“ کا بورڈ لگا دیکھ کر بھی میرے آفس کا دروازہ کھٹکھٹا سکے..... میں نے چونک کر سر اٹھایا تو دروازے میں وہی کھڑی تھی۔ ہاں..... وہ سعدیہ ہی تھی..... میری پہلی محبت..... وہ ذرا بھی تو نہیں بدلی تھی..... بلکہ اُس کا سوگوار ساجن اور بھی کچھ نکھر گیا تھا۔ میرے ہاتھ سے پین جھوٹ گیا۔ ”سعدیہ.....؟ تم.....؟ یہاں.....؟“ وہ جھجکتی ہوئی اندر آگئی اور پھر اُس نے جو بتایا وہ میرے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ چھ مہینے پہلے تک ایک خوش حال زندگی گزار رہی تھی کہ اچانک ایک دن اُس کا باپ ایک ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔ باپ کی دولت اور جائیداد شوہر کے قبضے میں آئی تو اُس نے نہ جانے کن الٹے تلووں میں اُڑادی اور رفتہ رفتہ اُس کا رویہ سعدیہ سے بھی بد سے بدتر ہوتا گیا۔ باپ کی موت سے ٹھیک دو ماہ بعد اُسے طلاق کا تحفہ دے کر گھر سے نکال دیا گیا اور پچھلے پختے ہی وہ اپنی عدت ختم کر کے نوکری کی تلاش میں نکلی تو اُسے میرا پتا چلا اور آج وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس نے اپنے باپ کے ایکسیڈنٹ کی جو تاریخ بتائی تھی وہ ٹھیک اُس سے اگلا دن تھا جب میں نے اپنے گلے میں یہ سرخ دھاگا باندھا تھا۔ میں نے مشکوک نظروں سے اُس کے پیچھے صوفے پر اکڑوں بیٹھے اُس شیطان کے چیلے کو دیکھا جس نے اپنے کاندھے اُچکائے اور میرے دل کی جانب اشارہ کیا۔ یہ سچ ہے کہ جب سے سعدیہ مجھ سے بگڑی تھی تب سے لے کر آج تک میرے دل میں اُس کے ظالم اور امیر باپ کے لیے شدید نفرت بھری ہوئی تھی اور دن میں کئی مرتبہ خیال آنے پر میں اُس کا قتل بھی کرتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ اُس بے چاری کی زندگی ہی تباہ کر ڈالے۔ میں نے سعدیہ کو تو فوراً نوکری پر رکھ لیا اور اُس کی نظروں میں پڑا۔ ایک پرانی چاہت کے پھر سے جاگ اٹھنے کا پیغام بھی پڑھ لیا۔ لیکن اُس کے کمرے سے نکلتے ہی میں چھلاوے پر برس پڑا۔ وہ کچھ دیر اطمینان سے میری کڑوی سیلی باتیں سنتا رہا۔ پھر اطمینان سے بولا۔ ”بڑے ناشکرے ہو یار..... کیا یہ بھی تمہارے اپنے دل کی ایک چھپی ہوئی حسرت نہیں تھی کہ وہ ایک بار پھر سے کسی کچے ہوئے پھل کی طرح تمہاری آغوش میں آگرے..... ساری زندگی اُس کے لیے آہیں بھرتے رہتے۔ وہ ٹھیک تھا، یا یہ بہتر ہے کہ اب وہ جو میں گھٹے تمہارے اُس پاس رہے گی..... اب بننے کی کوشش مت کرو..... میں نے دیکھا تھا تم کس طرح بھوک نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں لا جواب سا ہو گیا۔“ ہاں مگر..... اس طرح..... میرا مطلب ہے اُس کی زندگی برباد کر کے.....“ وہ ہنسا ”ایک بات یاد رکھو..... اس دنیا میں تمہاری آبادی جیسی ممکن ہے جب تم دوسروں کی بربادی کی فکر چھوڑ دو..... جاؤ اب اُس کے ساتھ عیش کرو۔“ میں نے غصے سے اُس کی جانب دیکھا ”کیا مطلب ہے تمہارا..... وہ عیش کرنے کی چیز نہیں ہے۔ تم جانتے ہو میں اُس سے بچی محبت کرتا ہوں۔“ وہ پھر زور سے ہنسا ”اُف..... یہ تم انسانوں کے چونچلے، محبت سچی ہو جھوٹی..... تم لوگوں کی ہر محبت کا انجام آخر کار ہوس ہی ہوتا ہے..... تم چاہو تو سچی محبت کے نام پر اپنا مقصد حاصل کر لو..... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے..... ہونا آخر میں وہی ہے جو ہم دونوں ہی جانتے ہیں۔“ میں نے لا جواب ہو کر سر ہٹا۔ اُس شیطانی دماغ سے لڑنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ بہر حال کچھ دن کے لیے ہی سہی، لیکن میری زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی آنے لگی تھی..... سعدیہ نے آتے ہی میرے دفتر اور میرے دل کا سارا نظام یوں سنبھالا کہ کچھ بل کے لیے میری اس ویران زندگی میں بھی بہار آئی گئی۔ چھلاوے کے ساتھ میرے معاہدے کو چھ مہینے گزر چکے تھے اور ابھی چھ مہینے مزید باقی تھے۔





## تیسری رات

اصغر صاحب کی داستان ابھی جاری تھی لیکن ہماری دوسری رات بھی اسی داستان گوئی میں صبح کے سپیدے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ مجبوراً ایک بار پھر ہمیں باتوں کا سلسلہ روکنا پڑا۔ میں نماز پڑھنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور اصغر صاحب اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ میں چاہتے ہوئے بھی اُن سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ آخرب اس درگاہ پر اُن کی موجودگی کی وجہ کیا ہے؟ میں جانتا تھا کہ وقت آنے پر یہ راز بھی خود ہی کھل جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ وقت آج کی تیسری رات کا ہی ہو۔ کیوں کہ مجھے اصغر صاحب کی داستان اپنے منطقی انجام کی جانب بڑھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اگر میں خود آج سے چھ ماہ پہلے والا ساحر ہوتا تو میں کبھی بھی اُن کی اس ساری کہانی پر یقین نہ کرتا۔ کیوں کہ اس جدید سائنسی دور میں ایسی منفی مثبتی قوتوں کا موجود ہونا از خود ایک بہت بڑا سوال ہے۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ سلطان بابا ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ دنیا میں ازل سے لے کر اب تک نیکی اور بدی کی جنگ جاری تھی اور جاری رہے گی۔ اور پھر خود ہمارا نفس بھی تو ایک چھلاوہ ہی ہے۔ ہم سے چھل کرنے والا ہمیں فریب اور دھوکے میں رکھنے والا کیا ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ خود ہمارا نفس ہمارے سامنے کبھی اسی چھلاوے کی صورت آکھڑا ہو جاتا ہو جیسے اصغر صاحب والا چھلاوہ اُن کے لیے ہزاروں نفسانی ترغیبات لے کر آکھڑا ہوا تھا؟

چنانچہ ایسے اور نہ جانے کتنے سوالات تھے جو میرے ذہن میں ایک عجیب سی اٹھل پٹھل مچائے ہوئے تھے۔ اب مجھے دھیرے دھیرے اصغر صاحب کے پُر اسرار رویے اور نماز کے وقت اُن کے غائب ہو جانے کی وجہ بھی سمجھ میں آرہی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ چھلاوہ پچھلے سال دسمبر میں اُن پر واضح ہوا تھا اور یہ مہینہ بھی دسمبر کا ہی تھا۔ مطلب یہ کہ ابھی اُن کے معاہدے کے کچھ دن باقی تھے؟؟

اصغر صاحب رات بھر کے جگ راتے کے بعد سوئے ہوئے تھے۔ میں نے دن گیارہ بجے کے قریب درگاہ کا پانی وغیرہ بھرا اور ابھی میں گھڑوں اور صراحیوں کو انگور کی بیلوں کے نیچے رکھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ کرم دین اپنی لمبی سی ڈانگ لیے بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا درگاہ میں داخل ہوا ”سلام عبداللہ باؤ..... بڑی اور چھوٹی مالکن آئی ہیں.....“ میں چونکا..... ”بڑی مالکن اور لاریب، یوں اچانک.....؟..... خیر تو ہے۔“ لیکن کرم دین کے جواب سے پہلے ہی وہ دونوں بھی درگاہ کے احاطے تک پہنچ چکی تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا اور اُن کے ساتھ ہی کھڑے ہو کر دعا پڑھ لی اور خود کچھ دُور جا کر کھڑا ہو گیا تاکہ وہ اپنے ساتھ لائی ہوئی چادر وغیرہ چڑھا سکیں۔ ان معمولات سے فارغ ہو کر بڑی مالکن میری جانب پلٹیں۔

”بھئی یہ تو بڑی وعدہ خلافی ہوئی۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ حویلی کا چکر ضرور لگاؤ گے۔ لیکن لگتا ہے تمہیں حویلی کے مکینوں سے کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے.....“

میں کچھ ہڑبڑا سا گیا۔ ”نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں یہاں درگاہ میں میرے علاوہ ایک مریض بھی موجود

ہے۔ اُس کی وجہ سے بھی پاؤں کچھ بندھے ہوئے ہیں۔ اور پھر سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہاں تنہائی میں بڑا سکون ملتا ہے۔ البتہ مجھے اپنا وعدہ اچھی طرح یاد ہے اور بہت جلد وفا بھی ہوگا۔ بس آپ کسی خاص مدت کی شرط نہ لگائیں۔ یہ میری آپ سے التجا ہے۔۔۔۔۔“ وہ میری لمبی تمہید سن کر مسکرا دیں۔ ”اپنا دفاع کرنا خوب جانتے ہو۔۔۔۔۔“ اتنے میں کرم دین نے انہیں بتایا کہ وہ پرندوں کا دانہ اور چوری تانگے سے اُتر والا یا ہے۔ بڑی مالکن نے اُسے ساری چیزیں صحن میں لانے کا کہا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دے کر آگے بڑھ گئیں۔ لاریب جو اُن سے دو قدم پیچھے کھڑی ہماری گفتگو سن رہی تھی، آگے بڑھ آئی۔ میں نے اُس سے پوچھا ”آپ کیسی ہیں۔۔۔۔۔؟ آگے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت ملی، یا نہیں آپ کو۔۔۔۔۔“ وہ مسکرائی ”ابھی مقدمہ جاری ہے۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ خان جی مان جائیں گے۔۔۔۔۔“ وہ خان صاحب کو خان جی کہتی تھی۔ ”جی مجھے بھی یہی اُمید ہے۔۔۔۔۔ اور سنا ہے کہ آپ کو اپنی بات منوانے کے بہت سے گرجے آتے ہیں۔۔۔۔۔“ میری بات سن کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ وہی چکی ڈمین سے تازہ جھرنے کے پھوٹے جیسی آواز۔۔۔۔۔“ سچ پوچھیں تو آپ سے مل کر ایک نئی تازگی کا احساس ہوا ہے مجھے۔ میں اس سے پہلے مذہب میں اتنی طاقت اور کشش کی قائل نہیں تھی۔ لیکن آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ابھی کھوج کرنے والے باقی ہیں۔“ پھر یکا یک وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”مجھے آپ سے بہت سے سوال کرنے ہیں۔ ساخر سے عبداللہ تک کے اس سفر کے بارے میں۔ آپ کی امی سے زہرا کے بارے میں بھی بہت کچھ سنا ہے اور میں اُس خوش نصیب کی ایک جھلک ضرور دیکھنا چاہوں گی۔ جس کے رُخ سے منعکس ہوتی دھوپ نے پل بھر میں آپ کی کایا پلٹ دی۔ کیا دنیا میں اب بھی ایسے مقدر والے ہوتے ہیں جو اپنے جلوے میں ایسے محو رہے لیے پھرتے ہیں؟ لیکن میرے سارے سوال ہمیشہ تشوہ رہ جاتے ہیں۔ کیا آپ کے اندر کا مذہب آپ کو ان سوالوں کے جواب دینے سے روکتا ہے، یا پھر آپ بھی مرد عورت کی تقسیم میں پڑے رہتے ہیں۔۔۔۔۔؟“

اُسے الفاظ برتنے کا ہنر خوب آتا تھا۔ تو گویا اُس شوخ ادا اور چنچل ہنسی کے پیچھے ایک نہایت حساس ذہن اور گہری سوچ بھی موجود تھی۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ میرا مذہب مجھے کسی سوال کے جواب سے نہیں روکتا، نہ ہی میں عورت اور مرد کی کسی تقسیم میں ذہنی طور پر بٹا ہوا ہوں۔ سچ صرف اتنا ہے کہ میں تو ابھی تک خود سراپا سوال ہوں۔ جواب دینے کے لیے جس کا ملیت کی ضرورت ہے میں اُسی سے کوسوں دُور ہوں ابھی۔ اور شاید یہ مختصر زندگی سوالوں میں ہی گزر جائے۔ پھر بھی اگر میرے پاس آپ کے لیے کوئی جواب ہوا تو میں اسے آپ کے ساتھ بانٹنے میں بخل سے کام نہیں لوں گا۔“ وہ میری بات سن کر کسی چھوٹے بچے کی طرح خوش ہو گئی ”تو پھر میں کب تک توقع رکھوں اپنے سوال پیش کرنے اور آپ کے جوابات ملنے کی۔۔۔۔۔ یاد رہے کہ آپ نے ابھی خود زندگی کے مختصر ہونے کی پابندی بھی بیان کر دی ہے۔۔۔۔۔“ مجھے اُس کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔ ”ہاں واقعی۔۔۔۔۔ یہ کبھاری تو میں نے خود ہی چند لمحوں پہلے اپنے پیروں پر ماری ہے۔ لہذا اب آپ وقت کا تعین خود ہی کر دیں تو بہتر ہوگا۔ میں حاضر ہوں ہر طرح سے۔“ اُس نے اپنی فتح کا اعلان کر دیا۔ ”تو پھر ٹھیک ہے کل رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے۔ میں خان جی کو بھی آج ہی آپ کی آمد کا بتا دوں گی۔ وہ خود بھی کئی بار آپ کا پوچھ چکے ہیں۔“ میں نے غور سے اُس کی جانب دیکھا۔ ”کیا آپ کے سوال اُن کی موجودگی میں اپنے اصل لفظ و معنی اختیار کر سکیں گے۔۔۔۔۔ اور کیا خود میں اُن کی موجودگی میں آپ کو جواب دینے کے قابل ہوں۔“ وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ مجھے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہے۔۔۔۔۔ آپ خان جی کے سامنے بندھے رہیں گے۔ چلیں یہ مسئلہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں اور اس بات کا یقین لے کر ہمارے گھر آجیے



گا کہ میں آپ کو کسی امتحان میں نہیں ڈالوں گی.....“ کچھ ہی دیر میں بڑی مالکن بھی اپنی مصروفیت سے فارغ ہو گئیں اور رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر مجھے یقین یاد دلایا کہ اب وہ اور اُن کے گھرانے والے مجھے غیروں میں شمار نہیں کرتے۔ لہذا میں بھی اپنے دل و دماغ میں کوئی گرہ باقی نہ رکھوں۔ وہ لاریب کو مجھ سے باتیں کرتا ہوا دیکھ چکی تھیں اس لیے اُس کی جانب دیکھ کر مسکرائیں اور مجھ سے بولیں ”تم نے میرے بلاوے کو تو بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا لاریب کی دعوت رد کرو تو جانوں..... اسے بھی تمہاری طرح لفظوں سے کھیلنے کا ہنر خوب آتا ہے۔“ وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ مطلب انہیں پتا تھا کہ لاریب مجھے کل رات حویلی مدعو کرے گی؟؟ بہر حال اب تو میں ہاں کہہ چکا تھا، لہذا اس مدعو پر زیادہ سوچ بچار سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی بھاگ دوڑ میں شام بھی ہو گئی اور پھر اصغر صاحب نے بھی مغرب سے ذرا پہلے اپنے ”حجرے“ سے باہر جھانکا۔ مجھے عجیب بے چینی سی ہو رہی تھی کہ کب میں ان روزمرہ کے معمولات سے فارغ ہو کر اُن کے سامنے جا کر بیٹھوں گا اور کب وہ اپنی داستان مکمل کریں گے۔ حیرت ناک بات یہ تھی کہ یہ تیسری رات آرہی تھی جب میں پورے چوبیس گھنٹوں میں صرف دو تین گھنٹوں کی نیند لے پا رہا تھا لیکن پھر بھی تھکاوٹ اور نیند کے کچھ خاص آثار میرے دماغ اور جسم پر طاری نہیں ہو پائے تھے۔ خدا خدا کر کے رات ڈھلی اور عشاء کی نماز کے بعد میں اُن کے سامنے اس بچے کی طرح آ بیٹھا جس کی کہانی جھپلی رات آدھی رہ گئی ہو اور اُس نے پورا دن اسی رات کی اُس میں گزار دیا ہو کہ آنے والی رات اُسے پھر سے خوابوں کے اُسی پرانے دیس میں لے جائے گی۔ اصغر صاحب نے ایک گہری سانس لی اور سلسلہ داستان پھر سے جوڑا۔

”ہاں تو عبداللہ میاں..... میں تمہیں بتا رہا تھا کہ سعدیہ کے آنے سے زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی تو آئی لیکن ایک اور عجیب بات بھی میں نے محسوس کی۔ جس سعدیہ کو میں اُس کی شادی سے پہلے جانتا تھا اور جس کی محبت میری زندگی کا پہلا عشق اور پہلا جنون تھا، جس کے لیے کبھی میں ماہی بے آب کی طرح تڑپا کرتا تھا، جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں گھنٹوں کڑی دھوپ میں، برستی بارشوں میں صبح و شام اُس کی کلاس اور گھر کے چکر لگایا کرتا تھا، جس کے منہ سے باتیں نہیں موتی جھڑتے تھے اور جس کے چند بول سننے کے لیے میری سماعتیں ترستی تھیں، آج بھی اُس کی دل کشی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اب وہ گھنٹوں بولتی رہتی تھی تب بھی میرے اندر وہ حلاوت نہیں گھول پاتی تھی جو پہلے صرف اُس کے منہ سے ”اصغر“ کا لفظ سنتے ہی میری سماعت سے میرے رُوح کے آخری ریشے تک گھل جاتی تھی۔ اب وہ زیادہ تر اپنے گزشتہ شوہر اور اُس کی بُری عادتوں کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ وہ اُسے کتنا سنا تھا۔ وہ اُس کا کتنا خیال رکھتی تھی۔ اُس نے اپنے شوہر کی خاطر کتنی قربانیاں دیں لیکن وہ کس قدر بے وفا نکلا، وغیرہ وغیرہ۔ نہ جانے اُس کی ساری خوب صورت باتیں کہاں کھو گئیں تھیں۔ وہ میری رباعی، وہ خیام کی غزل، وہ تصور جانان کی باتیں..... وہ گرتی پھوار اور وہ رم جھم جھسی بوندوں والی باتیں۔ جانے یہ عورتوں کو گزرتی عمر کے ساتھ ساتھ کیسی کیسی نفسیاتی الجھنیں گھیر لیتی تھیں کہ اُن کے اندر صرف ایک عورت ہی باقی رہ جاتی ہے..... محبوبہ نہ جانے کہاں کھو جاتی ہے۔ سعدیہ کے اندر سے بھی میری وہ دل بر، وہ لیلیٰ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی اور صرف سعدیہ کا جسم ہی باقی چھوڑ گئی تھی۔ تب مجھے ایک اور بھی عجیب سا ادارک ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری محبت کے تقاضے بھی بدلتے جاتے ہیں۔ اور یہ کہ انسان ایک بار اپنی جس چاہت کو برسوں پہلے کھو چکا ہو، اگر قدرت خوش نصیبی سے اُسے زندگی میں دوبارہ کبھی پانے کا موقع فراہم بھی کرے تو عقل مند وہی ہے جو اس محبت کو بس دُور ہی سے سلام کر کے آگے بڑھ جائے، کیوں کہ ہو سکتا ہے وہ حال میں اپنی محبت پانے

کے چکر میں اپنی ماضی کی چاہت، اپنا جنوں بھی گنوا دے۔ وہ ایک احساس بھی کھو دے جس کے بھروسے اور جس کے سہارے وہ آج تک جیتا آیا ہو۔ میرے ساتھ بھی شاید کچھ ایسا ہی ماجرا چل رہا تھا۔ کبھی کبھی تو میں یہ بھی سوچنے لگتا کہ اگر سعد یہ اُس وقت مجھے مل بھی گئی ہوتی تو شاید آج ۲۵ سال بعد وہ ایسی ہی ہوتی۔ لیکن تب شاید میں اُس کے ساتھ زندگی اور وقت گزارنے کی وجہ سے اُس کی ان جان لیوا تبدیلیوں کو محسوس نہ کر پاتا جو اس لمبی جدائی کی وجہ سے میں اب محسوس کر سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے خود میرے اندر بھی کئی ایسی تبدیلیاں آ گئی ہوں جیسی میں سعد یہ کے اندر محسوس کر رہا تھا؟ گویا محبت وہی اچھی جو وقت پر حاصل ہو جائے۔ شاید محبت کے معاملے میں ”دیر آید درست آید“ والا مقولہ درست نہیں تھا۔ پتا نہیں مجھے ایسا کیوں لگے لگا تھا کہ آخری محبت وہی رہتی ہے جو لا حاصل ہو۔ جو حاصل ہو جائے وہ محبت تو ہو سکتی ہے، آخری محبت نہیں۔ میرے اندر سے رفتہ رفتہ وہ جنوں، وہ تڑپ اور کسک ختم ہوتی جا رہی تھی جو کبھی بھی محبت نامی جذبے کا حاصل ہوتی ہے۔ کیا وہ سبھی جوڑے جنہیں اپنی محبت مل جاتی ہے وہ بھی اسی تجربے سے گزرتے ہوں گے جس سے میں ان دنوں گزر رہا تھا؟ کیا محبت دھیرے دھیرے یوں چنچ کر ٹوٹ بھی جاتی ہے جیسے خشک اور کمزور شاخیں.....؟

لیکن وہ میری محبت کو یوں چٹختے اور ترختے ہوئے دیکھ کر خوب قہقہے لگاتا اور مجھے طعنے دیتا کہ ”کیوں..... میں نہ کہتا تھا کہ تم انسان کہیں تک کر نہیں بیٹھ سکتے..... نہ تمہارے جذبے لافانی ہیں اور نہ تمہارا ایثار..... نہ تمہاری محبت سچی ہے نہ تم لوگوں کو آج تک نفرت کرنے کا صحیح ڈھنگ آیا..... تم انسان صرف اور صرف جذباتی پتلے ہو..... بس جس طرف کی ہوا دیکھی اُسی طرف کے ہو لیے..... تمہاری ہر محبت ہوس کا نتیجہ ہے اور تمہاری ہر نفرت تمہاری ذاتی انا کا شاخسانہ ہوتی ہے۔“ ایک دن وہ میری آفس کی الماری پر بیٹھا مجھے اسی طرح کے طعنے تیروں سے چھلٹی کر رہا تھا کہ میں بھی آخر کار بھڑک اٹھا ”تم ہمیشہ ہم انسانوں کی غلطیاں گنواتے رہتے ہو..... ہمیں اس کائنات کی ارزاں ترین مخلوق ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہو کبھی اپنے دامن میں بھی جھانک کر دیکھا ہے.....؟ تمہارے جدا مجد کی ایک غلطی نے آسمان سے زمین پر لا پھینکا تمہیں..... اور اب ابد تک تمہارا کام صرف مجھ جیسوں کو شکار بنانا ہے..... لیکن اگر میں نے تمہاری دوستی قبول کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی سارے کے سارے بھی مجھ جتنے کمزور اور لاعقیدہ ہیں۔ ہم میں کچھ ایسے بھی ہیں جن پر تمہارا جادو ذرا سا بھی نہیں چل پاتا۔“

میری بات سنتے ہی وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔

”غلط فہمی ہے تمہاری..... تمہاری اس لاغر اور بے ایمان مخلوق میں کوئی بھی ایسا نہیں جس پر میرا حرنہ چل پائے..... تم سب موم کی وہ ناک ہو جسے میں جب چاہوں موڑ کر رکھ دوں..... مجھے کبھی آزمانے کی بے وقوفی مت کرنا..... ہار جاؤ گے.....“

مجھے بھی غصہ آ گیا ”نہیں..... غلط فہمی مجھے نہیں..... تمہیں ہے..... تم کیا سمجھتے ہو کہ دولت کے انبار لگا کر اور ہم جیسوں کو عیش و عشرت میں ڈال کر تم نے پوری بازاری جیت لی ہے..... نہیں..... کچھ لوگوں کی منزل یہ دولت، یہ عیش نہیں..... کچھ اور ہے.....“

اُس نے غصے میں میری میز پر پڑی سب ہی چیزیں الٹ دیں ”دولت.....؟..... عیش و عشرت.....؟ تم کم ظرفوں کی تان ہمیشہ انہی دو چیزوں پر آ کر کیوں ٹوٹتی ہے؟ اور تم انسان جانتے کیا ہو دولت اور عیش کے بارے میں.....؟..... کہاں آتا ہے تم لوگوں کو دولت کو برتنا اور عیش کرنا.....؟..... تم لوگوں کو جب بھی ذرا مال میسر آیا تو کیا کیا کیا..... دو چار جام لٹھا کر اُلٹے پڑ گئے، یا پھر چار بازاں کھیل لیں اور اپنی پسند کا کوئی ایک جسم



منتخب کر کے رات بیتا دی۔ کیا ہے تم لوگوں کی عیاشی، شراب، جوا اور عورت..... بس..... یہی عیاشی ہے تم لوگوں کے نزدیک.....“

آج تک اُس نے مجھے خوب زخم لگائے تھے۔ اپنے طفر کے تیروں سے مجھے خوب چھلنی کیا تھا لیکن آج جب میں نے اُسے اپنی ایک ضرب سے یوں تڑپتے ہوئے دیکھا تو مجھے بہت مزہ آیا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔ ”تم لوگوں نے تو اپنی جنت کا تصور بھی انہی چند آسائشوں سے وابستہ کر رکھا ہے۔ شراب، عورت، ہیرے، موتی اور جواہر..... کم ظرف کہیں کے..... پھر بھی تم لوگ خود کو جنت کا حق دار سمجھتے ہو..... اور تم لوگوں میں سے کچھ دو غلے وہاں یہ سب کچھ پانے کے لیے چند دن یہاں کی زندگی میں ان چیزوں سے دُور بھاگتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ چیزیں یہاں میسر ہوں، یا وہاں..... مقصد تو ایک ہی ہونا..... پھر یہ نیک اور زاہد بننے کا ذرا مدد کیسا.....؟..... اور یہ جو تمہارے اندر کچھ لوگ برائے نام اپنے رب کی اطاعت کا دھکوسلا کرتے رہتے ہیں، انہوں نے اپنے رب کو جانای کب ہے.....؟..... تم سب کسی ایک کی رحمت کے صدقے جی رہے ہو..... دنیا بھی پار ہے ہو اور دین کے ٹھیکے دار بھی بنے پھرتے ہو..... پتا نہیں خدا نے کیا سوچ کر تم جیسے قہر دلوں کو اس دنیا کی خلافت سونپ دی۔ جب کہ کچھ تو یہ ہے کہ انسان جیسا کم ہمت، بزدل، احسان فراموش، جھوٹا، دھوکے باز، مکار اور فریبی اس پوری کائنات میں، اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں ہے.....“

میں نے اُس کی جھجھن سے لطف لیتے ہوئے کہا ”بولتے رہو..... تمہیں یوں، حقیر انسانوں، کی طرح تڑپتے اور گلے شکوے کرتے دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے.....“ اُس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پھر سمجھ گیا کہ آج میں اُس کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ وہ جھلا سا گیا۔ ”لعنت ہو تم پر..... واقعی تم انسان بڑے چال باز ہوتے ہو، آج تم نے مجھے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ چلو آج میں تمہیں اصل عیاشی کی ایک ہلکی سی جھلک دکھاتا ہوں۔ کیا یاد کرو گے کبھی زندگی میں ایک اصل دوست سے بھی واسطہ پڑا تھا تمہارا.....“

میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا۔ ”اصل عیاشی..... میں کچھ سمجھا نہیں.....؟“ اُس نے طفر سے میری طرف دیکھا۔ ”ہاں..... ایسی عیاشی جو تم جیسوں کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگی۔ تم لوگ عورت کو ہی دنیا کی سب سے ناقابل حصول مخلوق سمجھتے ہونا..... اور عمر بھر اسی کے حصول کے لیے بے ایمانیاں کرتے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہتے ہو..... اور بدلے میں پاتے کیا ہو..... صرف ایک آدھ جسم..... اور پھر اُس سے بھی دو چار سال کے اندر اُوب جاتے ہو..... ساری محبت، سارا عشق خشک مٹی کی طرح جھڑ جاتا ہے اور پھر باقی ساری عمر دوسری عورتوں کو دیکھ دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے رہتے ہو..... کبھی کسی فلم ایکٹر لیس پر فدا ہوتے ہو اور کبھی کسی ماڈل کے تصور میں ہی زندگی گزار دیتے ہو۔ آج میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ تمہیں آج تک زندگی میں ایسی جتنی عورتیں یاد ہیں جن کو تم کبھی بھی حاصل کرنا چاہتے تھے اُن سب کی اپنے ذہن میں ایک فہرست بنالو۔ اگلے چند گھنٹوں میں تم اُن سب کے ساتھ کچھ وقت گزارو گے۔ چاہے وہ ملک، یا دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتی ہو..... کہیں کی بھی فلم اُستار ہو، ماڈل ہو، کتنی ہی مشہور اور ناقابل حصول کیوں نہ ہو..... یا پھر چاہے کتنے ہی ہزار پردوں میں کیوں نہ چھپی بیٹھی ہو۔ آج وہ تمہاری دسترس میں ہوگی.....“ میں اُس کی بات سن کر کچھ جھینپ سا گیا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے میں شادی شدہ اور بیٹیوں کا باپ ہوں..... اب ایسی حرکتیں مجھے زیب نہیں دیتیں۔“ اُس نے میری بات سن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ ”اُف یہ انسان..... چاہے دل میں لادو ہی کیوں نہ پھوٹ رہے ہوں..... ہونٹوں پر قلعہ اور بناوٹ کا انکار ہی رہتا ہے..... اچھا چلو تمہارے اطمینان کے لیے یہ بتا دوں کہ ہوگی اصل میں تمہاری بیوی ہی.....“

یعنی ذہنی طور پر تم کسی بھی عورت کو بر تو..... جسمانی طور پر وہ ہوگی تمہاری اپنی ہی عورت..... لہذا اب خواہ مخواہ اپنے ضمیر نامی اس فضول احساس کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں، جو تمہیں گناہ سے روک تو نہیں پاتا، ہاں البتہ اس کا مزہ ضرور کر کرنا دیتا ہے..... لہذا مزہ کر کرنا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ذہن کو آزار چھوڑ دو تاکہ میری گرفت اس پر مضبوط سے مضبوط تر ہو سکے اور اپنے گھر چلو..... میں ایسے قماشے ہر کسی کو نہیں دکھاتا.....“

میں اسی شش و پنج میں گاڑی میں بیٹھا اپنے گھر کی جانب روانہ تھا۔ میں نے ایسی عورتوں کی اپنے ذہن میں فہرست بنانے کی کوشش کی جو زندگی کے کسی بھی دور میں کسی بھی طرح میرے لیے باعث کشش رہی ہوں لیکن اس مقام پر بھی مجھے چھلاوے کے سامنے شرمندگی ہی اٹھانی پڑی۔ اُس دن خود مجھ پر بھی انکشاف ہوا کہ میں نے آج تک کس قدر بے رنگ زندگی گزاری تھی۔ سوائے ایک آدھ فلم ایکٹر لیس کے مجھے اور کوئی عورت یاد ہی نہ آئی اور اس شیطان کے چیلے نے میری ”بے ذوقی“ پر اپنا سر پیٹ لیا۔ اسی فحالت میں میں نے گھر میں قدم رکھا تو استقبال کرنے والی پہلی وہی فلم ایکٹر لیس تھی۔ میں پوری طرح ہوشیار ہونے کے باوجود اُسے اتنے اپنے قریب پا کر حیرت کے جھٹکے سے گرتے گرتے بچا۔ پھر جب اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور میری خواب گاہ کا دروازہ بند کر کے پٹلی تو وہ سعدیہ تھی اور پھر جس نے مجھے پہلا جام پیش کیا وہ میری سہاگ رات والی میری بیوی تھی۔ لیکن جس نے میری ٹائی کھولی اور کوٹ اتار کر کھوٹی پر ٹانگہ وہ شائستہ تھی۔ پھر جس نے پیار سے میرے بال سہلائے اور میرا سراپچی گود میں رکھا وہ مشہور ماڈل تھی جس کے بل بورڈز میں ہمیشہ پہلے دفتر سے واپسی پر بس کی کھڑکی سے دیکھا کرتا تھا۔ پھر جس نے میرا لباس تبدیل کروایا وہ کوئی اور تھی اور جس نے خواب گاہ کی بتیاں مدھم کیں وہ کوئی اور..... یوں وہ رات میری زندگی کی ایسی رات تھی جب خود مجھے بھی زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے دل میں دہلی اور چھپی ہوئی بے شمار اور بے پناہ چاہتوں کے بارے میں پتا چلا..... کیسی رنگین اور کتنی سنگین رات تھی وہ.....

اور پھر مجھے ایک اور حقیقت کا ادراک بھی انہی دنوں ہوا کہ عیاشی صرف ہمارے ذہن کی ایک اختراع ہے۔ ہمارے جسم کے اندر اُندے مختلف ہارمون اور ان مادوں کی کارستانی ہے جنہیں ہمارا ذہن کنٹرول کرتا ہے۔ گویا ہم اپنے ذہن پر قابو پانا سیکھ لیں تو ہر عیاشی خود ہمارے در کی در بان بن سکتی ہے۔ شرابی کو جام کا نشہ، جواری کو اپنی بازی کی لت اور عورت کی تلاش میں جھٹکنے والوں کے لیے جسم کی لذت کا سرور..... یہ سارا کھیل ہی ذہن کا ہوتا ہے اور اگر ذہن یک سو نہ ہو تو ان سب کی عیاشیوں کی انتہا بھی اُسے ایک ذرہ برابر بھی لذت نہیں دے سکتی۔ لیکن عبداللہ میاں..... اس انسانی فطرت کا کیا کریں..... کہ ہر چیز کی زیادتی اور اس کا آسان حصول ہی ہمارے دل کو اس نعمت سے اُچاٹ کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔ سو میں بھی اُسے لگا اور پھر انہی دنوں ایک اور مصیبت طوفان کی طرح میرے گھر میں داخل ہوئی اور اس کے درد یوار کو لرزائی۔ میری چھوٹی بیٹی عظمیٰ نے ضد کر کے اُسی لوفر سے شادی کر لی اور میرا داماد میرے بڑے بیٹے کے ساتھ اُس کے کاروبار میں شریک بن گیا۔ دونوں مل کر زمین کی خرید و فروخت کا دھندا کرنے لگے اور پھر اُن کی نظر شہر کے سب سے اہم مرکز میں ایک قیمتی پلاٹ پر پڑ گئی۔ انہوں نے اپنی ہر ممکن اور سرتوڑ کوشش کر لی لیکن اس پلاٹ کا مالک اپنی زمین بیچنے پر راضی نہ ہوا۔ دراصل اُسے دولت کی کوئی کمی نہیں تھی اور وہ اُس زمین پر بچوں کے لیے پارک بنانا چاہتا تھا لیکن ان دولت کے پجاریوں کو یہ کہاں قبول تھا کہ وہ سونے جیسی زمین کسی پارک کی تعمیر کے لیے چھوڑ کر ضائع کر دی جائے۔ سو میرے بیٹے اور داماد دونوں نے اس پلاٹ کے مالک سے آخری بار بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اُس کے گھر پہنچ گئے۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد بھی وہ شخص اپنی بات پر اڑا رہا۔ بحث گر ماری میں تبدیل ہو گئی اور میرے داماد نے مشتعل ہو کر اپنے کوٹ کی جیب سے پٹل نکالا اور چھکی چھک گولیاں اُس بے گناہ کے سینے میں



داغ دیں۔ مالک زمین وہیں ٹھنڈا ہو گیا اور میرا داماد اور میرا بیٹا دونوں فرار ہو گئے لیکن کب تک چھپتے؟ مقتول کے ورثاء بھی بہت اثر و رسوخ والے تھے اور انہوں نے عدالت سے میرے داماد اور بیٹے کو پھانسی پر لٹکانے کا فیصلہ کر ہی دم لیا۔ میری بیوی یہ سنتے ہی ایسی بستر پر گری کہ پھر فالج کے اثر سے نکل ہی نہیں پائی۔ میرا سارا گھربوں کھڑ گیا کہ پھر کبھی سٹ نہ پایا۔ میں نے پھر اپنے اسی دوست کی طرف مدد کے لیے دیکھا جو شاید کہیں نہ کہیں خود ہی میری اس ساری بربادی کا فہمدار تھا۔ تب اُس نے یہ کہہ کر میرے ہوش اُڑا دیے کہ وہ اپنی ہی ایک کوشش تو کر دیکھے گا لیکن اگر میرے بیٹے اور داماد کی سانسیں اس دنیا میں اتنی ہی لکھی ہیں تو پھر وہ بھی کچھ نہیں کر پائے گا کیوں کہ وہ کسی کی جان قبل از وقت لے تو سکتا ہے لیکن کسی کی سانسیں بڑھانے نہیں سکتا۔ کیوں کہ کچھ چیزیں قدرت نے صرف اپنے اختیار میں ہی رکھی ہیں۔ میں اُس پر بہت برسا کہ اُس نے پہلے مجھے یہ سب کیوں نہیں بتایا، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ آخر کار وہ دن بھی آپہنچا جب بیٹے اور داماد دونوں کی لاشیں وصول کرنے کے لیے میں سنٹرل جیل کے باہر کھڑا تھا۔ میں نیم پاگل ہو چکا تھا اور میرے گھر میں موت کا دھماکا اور سناٹا چھایا کہ پھر ہم میں سے کوئی بھی مسکرا نہ سکا۔ بڑی بیٹی نے چند دن صبر کیا اور پھر وہ بھی اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ نہ جانے کہاں نکل گئی۔ میری دولت میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اس سے کہیں تیزی سے میں اپنے سارے رشتے ایک ایک کر کے کھوتا گیا۔ مجھے اس دولت، اس عیش و عشرت کی زندگی اور خود اپنے وجود سے نفرت سی ہو گئی۔ مجھے چھلاوے کی شکل بھی اب ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی تھی لیکن میں اس معاہدے کی وجہ سے معذور تھا اور پھر آخر کار اُس نے بھی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ اب وہ ہر وقت مجھ سے اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا کہ ہمارا معاہدہ ختم ہونے میں صرف دو ماہ ہی باقی رہ گئے ہیں لیکن میں نے اب تک ایک بھی ڈھنگ کا کام نہیں کیا اُس کے لیے۔ لہذا اب یا تو میں معاہدے میں ایک سال کی توسیع کر لوں، یا پھر اس کا کم از کم ایک بڑا کام ضرور سرانجام دوں۔ میں نے اُس کو صاف بتا دیا کہ میں اب اس معاہدے سے بیزار ہو چکا ہوں لہذا وہ اپنا کام بتائے تاکہ میں اُسے انجام دے کر اس دھاگے کو کاٹ دوں اور عمر بھر کے لیے اس عذاب سے اپنی گلو خلاصی کر لوں۔ اُس نے پھر مجھے احسان فراموش ہونے کا طعنہ دیا لیکن میں اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر کار اُس نے وہ کام مجھے بتا دیا اور مجھے اس درگاہ پر وہ عمل سرانجام دینے کے لیے بھیج دیا جس کے بعد میں ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤں گا۔ تب سے لے کر میں اب تک یہیں اس درگاہ پر پڑا ہوں۔ دیکھو کہ اب کب مجھے اُس کی جانب سے آخری حکم ملتا ہے اور کب میری آزادی کا پردانہ میرے ہاتھ میں آتا ہے۔ ویسے بھی میری آزادی میں اب صرف ۲۹ دن ہی باقی رہ گئے ہیں۔“

اصغر صاحب نے اپنی داستان ختم کر کے اس طرح ایک لمبا سا سانس لیا جیسے اُن کے دل پر رکھانوں بوجھ اُتر گیا ہو۔ صبح کی سپیدی کے آثار نظر آرہے تھے اور دُور نیچے گاؤں کی مسجد سے صبح کی اذان کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر اصغر صاحب سے پوچھا ”لیکن وہ آخری حکم کیا ہے جس کے لیے آپ کو اس درگاہ میں بھیجا گیا ہے..... آپ کو کیا کرنا ہے یہاں.....؟“

”قتل.....“ اصغر صاحب نے دُور خلا میں گھورتے ہوئے کہا ”مجھے یہاں ایک قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے.....“



## معصوم قاتل

اصغر صاحب کی بات سن کر میں اُچھل پڑا۔ ”قتل..... لیکن کس کا.....؟“ انہوں نے لمبی سی سانس بھری ”یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ اُس نے کہا ہے کہ وقت آنے پر مجھے خود پتا چل جائے گا۔ تمہیں میں نے اپنی ساری کہانی من و عن اس لیے سنائی ہے کہ اس دنیا میں صرف تم ہی وہ واحد شخص ہو جس نے میرے علاوہ اس چھلاوے کا کوئی روپ دیکھا ہے.....“ یہ بے درپے حیرت کا دوسرا جان لیوا جھٹکا تھا میرے لیے..... ”میں نے چھلاوے کو دیکھا ہے؟..... کب.....؟ کہاں.....؟.....“ میں نے انہیں ہنھوڑی تو ڈالا.....

”جس شخص کو پہلے تم نے ٹرین میں اور پھر یہاں درگاہ کی چار دیواری کے باہر اندھیرے میں میرے ساتھ کھڑے دیکھا تھا وہی چھلاوہ ہے..... آج کل وہ مجھ سے اسی روپ میں ملتا ہے..... اُسے اس قسم کی شعبہ بازیوں کرنے میں بہت مزہ آتا ہے..... کچھ دن تک وہ خود میرے ہی دفتر میں چائے والا بن کر بھی آتا رہا، کبھی بس کنڈکٹر، کبھی میرا شو فر، کبھی کوئی دلال، کبھی کوئی سادھو..... جانے کس کس روپ میں وہ میری راہ کا تار ہا ہے۔“

اصغر صاحب کی بات سن کر میں سن سارہ گیا۔ تبھی وہ پارے جیسی صفت رکھنے والا شخص مجھے اس قدر بے چین کر گیا تھا کہ میں کئی راتوں تک ٹھیک سے سو بھی نہیں پایا۔ یا خدا..... یہ کیسی دنیا تھی، کیسے اسرار تھے۔ ابھی یا قوط کا فسون ختم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ یہ چھلاوہ میرے کالے نصیب کی تاریکی بڑھانے کے لیے چلا آیا تھا۔ اور پھر وہ آخر کس کے قتل کا حکم دے گا اصغر صاحب کو؟ اسی اُدھیر بن میں سارا دن گزر گیا اور شام سر پر آگئی۔ مغرب کے فوراً بعد نیچے کھائی میں بشرے کے تانگے کا مخصوص بھونچہ بجا۔ وہ ٹھیک وقت پر مجھے لینے کے لیے آ پہنچا تھا میں حویلی پہنچا تو خان صاحب نے بیرونی ڈیوڑھی کے باہر میرا استقبال کیا اور بڑی محبت سے مجھے اندر والے دیوان خانے میں لے گئے جہاں میں نے پہلی مرتبہ ماما پاپا کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہاں پہلے سے بڑی مالکن اور لاریب موجود تھیں۔ گویا خان صاحب نے صرف زبانی طور پر ہی مجھے گھر کا فرد اور اپنا بیٹا نہیں کہا تھا بلکہ آج انہوں نے یوں مجھے اپنی حویلی کے زمانے میں بلا کر اور یہ عزت دے کر عملی طور پر بھی یہ ثابت کر دیا تھا۔ بڑی مالکن اور لاریب نے ویسے تو پہلے بھی کبھی مجھ سے پردہ نہیں کیا تھا لیکن آج میں ایک مہمان کی حیثیت سے اُن کے گھر کی خواتین کے درمیان موجود تھا جو ان علاقوں میں بہت بڑی عزت اور بڑے مان کی بات سمجھی جاتی تھی۔ لیکن مجھے بہت جھک محسوس ہو رہی تھی۔ یہ عزت اور یہ مان بھی تو انسان کو کہیں نہ کہیں باندھ کر رکھ دیتا ہے، اُسے بے بس کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں سانپ کے زہر سے زیادہ اثر دار زہر یلانمک کا زہر ہوتا ہے۔ سانپ کا زہر تو پھر بھی کبھی نہ کبھی اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے لیکن کسی کے کھائے ہوئے نمک کے زہر کا اثر ظرف والوں کے خون سے کبھی بھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ شاید خان صاحب کے اندر بھی کوئی ایسا ہی بھرم تھا میری ذات کے لیے..... میرے ظرف کے بارے میں..... تبھی انہوں نے آج مجھے یہ مان لیا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر لاریب اور بڑی مالکن کھانے کا انتظام کرنے کے لیے اُٹھ گئیں۔ خان صاحب کی گفتگو جاری رہی۔ وہ ماما اور پاپا سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ خاص طور پر ماما جنہوں



نے مجھے اس راستے پر چلنے کی اجازت دی تھی اور پہا کی سادگی نے تو اُن کا دل ہی موہ لیا تھا کہ اتنا بڑا صنعت کار ہونے کے باوجود اُن میں دکھاوا اور خود پسندی نام کو بھی نہیں تھی۔

اسنے میں لاریب نے آکر بتایا کہ کھانا لگ گیا ہے اندر زانے میں ایک آدھ خادمہ کے علاوہ اور کوئی لاریب اور بڑی مالکن کی مدد کے لیے موجود نہیں تھا، یا پھر بڑی مالکن نے خصوصی طور پر مجھے اپنا سمجھتے ہوئے کسی نوکر کو کھانے کی میز کے گرد نہیں آنے دیا اور خود اپنے ہاتھوں سے میرے لیے نہ صرف کھانا پر دسا بلکہ ہر چیز ضد کر کے بلکہ حکم دے کر مجھے چکائی بھی۔ سبھی کچھ بہت اچھا بنا ہوا تھا۔ آدھی سے زیادہ چیزیں لاریب کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں اور پورے کھانے کے دوران اُسے یہی فکر کھائے رہی کہ کوئی چیز بد ذائقہ، یا بُری تو نہیں بنی۔ جب بھی میں کوئی نیا خوان چکھتا وہ تب تک میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہتی جب تک میں وہ لقمہ نگل نہیں لیتا تھا۔ اُس کی اس ”پہرے داری“ پر مجھے ہنس آگئی اور آخر کار مجھے اُسے کہنا پڑا ”آپ یقین کریں آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی تمام چیزیں معیار سے کہیں بڑھ کر اور نہایت لذیذ ہیں۔ لیکن اگر آپ اسی طرح میرے چہرے پر ہر نئی دُش کا ذائقہ تلاش کرتی رہیں تو مجھ سے بالکل نہیں کھایا جائے گا۔“ میری بات سن کر سبھی ہنس پڑے۔ خان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ”یہ جب بھی کوئی نیا تجربہ کرتی ہے، اس کا انداز میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بھئی میں تو اسے کہہ دیتا ہوں کہ یہ تو زبردستی تعریف کروانے کا طریقہ ہے۔“ یوں ہی ہنستے مسکراتے کھانا ختم ہوا اور پھر ہم نے بڑے کمرے میں بیٹھ کر کشمیری چائے بھی پی لی۔ میں نے خان صاحب سے اجازت چاہی تو لاریب نے جو بڑے کمرے میں ہی چائے کے برتن سمیت رہی تھی بڑے اعتماد سے مجھ سے جاتے جاتے کہا ”ابھی رُکیے..... میرے سوال ابھی باقی ہیں.....“ میں نے چونک کر لاریب کی جانب دیکھا کیا خان صاحب اور بڑی مالکن سے اُس نے پہلے ہی اجازت لے رکھی ہے؟ خان صاحب میری اندرونی کش مکش کو شاید میرے چہرے سے بھانپ چکے تھے وہ اٹھتے ہوئے بولے ”لاریب تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے عبداللہ میاں..... لیکن ضروری نہیں کہ تم اس کے ہر سوال کا جواب دینا چاہو.....“ مجھے اُس نے بتایا کہ تمہاری روایتی جھگ شایہ تمہیں میرے سامنے کھل کر بات کرنے سے روکے..... تم اطمینان سے بات کرو۔ میں ذرا اپنا حق تازہ کرواؤں اور زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں..... اس کے تاہر تو زسوالوں کی بوچھاڑ سے بچانے کے لیے اس کی ماں تمہاری مدد کے لیے بیٹیں موجود ہے.....“ وہ مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ اور میرے دل سے جیسے ایک بہت بڑا بوجھ سا ہٹ گیا۔ لاریب نے خان صاحب اور اپنی ماں کو اعتماد میں لے کر مجھے ایک بہت بڑے امتحان سے بچالیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس شخص کی بنی ہوئی لڑکی کا من کا سچ سے بھی زیادہ صاف اور آئینے کی طرح شفاف تھا لیکن داغ ہمیشہ ایسے ہی کورے کا سچ پر جلدی لگتا ہے۔ اور میں خان صاحب، یا بڑی مالکن کے کورے من پر اپنی جانب سے ذرا سی بی کھروٹ بچ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بہت مختلف اور بہت اعلیٰ انسانوں سے برتنے کا معاملہ تھا اور میں انہیں اُن کے معیار جیسا ہی برتنا چاہتا تھا۔

لاریب جلد ہی چائے کے برتن رکھوا کر خادمہ کے ہاتھ خشک میوے کی پراتیں اٹھائے چلی آئی۔ تب تک بڑی مالکن مجھ سے میری تعلیم اور دیگر مشاغل کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ انہوں نے اپنے بارے میں بھی مجھے بتایا کہ انہیں انٹرنیک شاعری سے کافی لگاؤ پیدا ہو چکا تھا اور اب بھی کبھی کبھار وہ اپنی بیاض میں کچھ لکھ لیتی ہیں۔ لاریب نے خادمہ کو پراتیں رکھ کر جانے کا کہا اور پھر وہ بھی بڑی مالکن کے ساتھ ہی سامنے والے

صوفی پر براہیمان ہوگئی۔ ”ہاں تو اب سب سے پہلے یہ بتائیں کہ میں آپ کو ساحر کے نام سے پکاروں، یا عبداللہ کہہ کر..... ویسے کیا یہ نام بدلنے کی رسم ادا کرنا ضروری تھا..... مذہب کی، یا ایسی کسی اور راہ پر چلنے کے لیے اپنی شناخت بدلنا ضروری ہے کیا؟“ میرا امتحان شروع ہو چکا تھا۔ متحین نے پہلا سوال پوچھ کر جواب کے انتظار میں اپنی آنکھیں مجھ پر گاڑھ دیں۔ ”آپ مجھے ساحر کے نام سے بھی پکار سکتی ہیں۔ نام صرف شناخت کا ذریعہ ہی تو ہوتے ہیں۔ یہ اب پکارنے والے پر منحصر ہے کہ اُسے کس نام کی شناخت پسند ہے۔ اور رہی بات نام بدلنے کی رسم کی تو شاید جس وقت میں اپنے کسی اور جنون میں اپنا گھر چھوڑ کر اس درگاہ پر سیرا کرنے کے لیے آیا تھا تب میری گزشتہ شناخت مجھ پر شدید طاری اور زیادہ حاوی تھی ایسے میں مجھے اس نئے ماحول سے جوڑنے کے لیے مجھے ایسی ہی کسی نئی شناخت کی ضرورت تھی اور ایسے ہی عبداللہ نام کی اس بدلی ہوئی پہچان نے مجھے بڑا سہارا دیا اور شاید یہی میرا نام بدلنے والوں کا مقصد بھی تھا۔“

وہ مطمئن سی ہوگئی۔ ”آپ نے میری الجھن تو ختم کر دی۔ اور سچ پوچھیں تو یہ بہت بڑی الجھن تھی کیوں کہ بہر حال مجھ جیسوں کے لیے اپنا بچپن کا نام ہی بہت بڑی شناخت ہوتی ہے اور اپنا جنم نام یوں ایک جھٹکے سے بدل دینا بھی بڑی ہمت والوں کا ہی کام ہے..... پھر آپ سے دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ نے اپنی دنیاوی چاہت کے لیے یہ بھیں بدلاتھا۔ پھر دھیرے دھیرے آپ کی چاہت نے اس راستے کو پائی لیا جس پر چلنے کے لیے آپ کے قدم درگاہ کی جانب پہلی بار بڑھے تھے۔ اس سفر میں زہرانے بھی آپ کی محبت کی طاقت کے سامنے ہتھیار ڈال ہی دیئے۔ آپ وہ تہذیب بھی سینے پر بجائے اس راہ پر آگے بڑھتے گئے۔ آپ جسموں کو نہیں رُوح کو فتح کرنے کے لیے اس رُوحانی راہ گزر کے راہی بن گئے..... لیکن یہ سفر آخر ختم کہاں ہوگا۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اس طرح گھر بار چھوڑ کر اور زہرا کو اپنا منتظر چھوڑ کر آپ ایک فرض کی ادائیگی کے لیے نکل آئے لیکن آپ نے اپنے پیچھے بہت سے فرض اُدھورے چھوڑ دیئے ہیں.....؟“

بڑی مالکن نے سرزنش بھری نظر سے لاریب کی جانب دیکھا جیسے انہیں لاریب کے سوالات کچھ چھو رہے ہوں۔ لاریب نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ ”اگر میں الفاظ کے چناؤ میں کچھ بے احتیاطی کر رہی ہوں تو پلیز آپ.....“ میں نے اُس کی بات پوری ہونے نہیں دی۔ ”نہیں..... آپ کا بیڑا یہ اور الفاظ کا چناؤ بالکل درست ہے۔ نمک کو نمک اور تھور کو تھور ہی کہا جاسکتا ہے..... قہر کہہ دینے سے اس کی تاثیر میں حلاوت شامل نہیں ہو جاتی۔ شاید یہ وہ سوالات ہیں جن کا سامنا مجھے عمر بھر کرنا ہے۔ اجہ چاہے تلخ ہو، یا آپ جیسا شیریں..... سوالوں کا مدعا تو یہی رہے گا۔ اور میرے پاس بہر حال اپنے ہر عمل کا جواب موجود ہونا ہی چاہیے.....“

وہ دونوں دم بخود بیٹھیں میری بات مکمل ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں نے اپنی دنیاوی چاہت کے لیے ہی یہ بھیں بدلاتھا۔ اور سچ پوچھیں تو فی الحال میں صرف بھیں بدلنے کی حد تک ہی کامیاب ہو پایا ہوں۔ آپ کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ خدا کو پانے کے لیے یوں بھیں بدل کر اپنا گھر بار چھوڑنے کی بھی قطعاً ضرورت نہیں..... اُسے تو اپنی شہرگ سے بھی قریب کہیں اُس پاس تلاش کرنا چاہیے۔ لیکن آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ ہمیں ہمارا ضمیر ہمیشہ اس شے، یا اس راستے کی طرف بڑھنے پر مجبور کرتا ہے جس مٹی سے اُسے اُٹھایا گیا ہوتا ہے۔ مصور کو اگر آپ بڑھتی لگا دیں اور بڑھتی کو مصور کا کام سونپ دیں تو کیا ہوتا ہے؟ کسی



موسیقا کو اینٹ گاڑا ڈھلائی کرنے والا مزدور بنوا دیں اور کسی مزدور کو کسی نازک پیا نو پر لا بٹھائیں تو کیا ہوگا؟..... بات کسی بھی راہ، یا علیے کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کی اور اُسے کسی فرض کو ترک کر کے اختیار کرنے کی نہیں ہے۔ بات رُوح کے قرض کی ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ میری رُوح کو اس کام کے لیے جہنم دیا گیا ہے اور مجھے اسی میں اپنا سکون، اپنی کاملیت دکھائی دی اور میں اس طرف چل پڑا۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے اگر مجھے ڈاکٹر، انجینئر، یا پائلٹ وغیرہ بننے کا جنون ہوتا اور میں اپنے والدین کی مجھے برنس مین بنانے کی خواہش کو رد کر کے ایسا کوئی شعبہ اختیار کر لیتا تو شاید دنیا کو اتنا عجیب نہ لگتا۔ تب شاید مجھے کچھ طرف سے داد و تحسین بھی ملتی کہ میں نے اپنا اتنا بڑا کاروبار چھوڑ کر اپنے دل کی مانتے ہوئے وہ شعبہ اختیار کیا جس میں میری خوشی تھی اور میری مثالیں دی جاتیں کہ اپنے فن اور شعبے کے لیے قربانی ہو تو ایسی ہو۔ تو کیا مذہب، یا رُوحانیت وہ شعبہ اور وہ فن نہیں ہو سکتا جس کی راہ کا طالب علم بننا میری خوشی ہے.....؟ بس تو میں نے اپنی خوشی سے ایک شعبہ ہی تو اختیار کیا ہے۔ اور کیا اگر میں ڈاکٹریٹ، یا برنس منجمنٹ کے لیے ملک سے باہر جاتا اور چار پانچ سال لگا کر واپس آتا تو کیا تب میں اتنا عرصہ ان رشتوں اور ان سے وابستہ فرائض سے دُور نہ رہتا؟ لیکن تب شاید یہ بھی میرے تمنوں میں مزید ایک تھفے کا اضافہ ثابت ہوتا کہ اپنے شعبے کی تکمیل کے فرض کی خاطر میں نے خونی رشتوں سے دُوری کی قربانی دینے سے بھی اجتناب نہ کیا۔ واپسی پر میرے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے اور میری سند کو چلی حروف میں میرے نام کی تختی پر کندہ کیا جاتا۔ تو پھر صرف اس راہ پر چلنے والوں پر فرائض سے بھاگنے کا الزام کیوں لگایا جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ شاید اس شعبے میں رو پیہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں..... کیا صرف جس شعبے سے انسان کو لگی بندھی تنخواہ مل سکتی ہو صرف وہی انسان کی کامیابی کی دلیل ہوتا ہے۔ رہی بات حلیے کی تو ہر شعبے کا اپنا ایک یونیفارم بھی ہوتا ہے جس طرح ڈاکٹر سفید کوٹ پہنتے ہیں، انجینئر ساٹ پر جاتے وقت سر پر کھنی ہیلمٹ پہن لیتے ہیں، پائلٹ کا ندھے پر پھول سجاتا ہے، اسی طرح اس شعبے کا بھی اپنا ہی ایک یونیفارم پہلے سے طے ہے۔ آپ سوچیں کہ میں تھری پیس سوٹ میں مزار کا مجاور بنا کیسے لگوں گا.....؟ بالکل اتنا ہی مضحکہ خیز جتنا اگر میں کسی برنس ایمرپاز کا فینچنگ ڈائریکٹر ہوتے ہوئے سفید کرتے پاجامے میں صبح اٹھ کر اپنے دفتر جا پہنچوں.....؟ یہ سادہ لباس ہی میرے شعبہ کا تقاضہ اور اس پر چلتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ صرف سادہ لباس ہی انسان کی رُوحانیت کی تکمیل کا باعث ہے۔ یہ تو ابتداء سے بھی پہلے کے چند لوازمات ہیں جنہی میں نے آپ کو شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ فی الحال میں صرف لباس کی تہذیبی تک ہی پہنچ پایا ہوں۔ اب رہا آپ کا آخری سوال کہ رُوحانیت کے اس سفر میں زہرا کی رُوح کو فتح کرنے کا مرحلہ کب آئے گا تو یہ فیصلہ تو میں نے اُسی پر چھوڑ دیا تھا۔ میری رُوح تو پہلے روز ہی اُس کی اسیر ہو گئی تھی۔ یہ فیصلہ اب زہرا کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنی رُوح کو کب میرے تصرف میں دینے پر خود کو آمادہ کرتی ہے۔ اور یہ زمینی فاصلے کبھی بھی اُس سے دُوری کا احساس نہیں دلا پائے۔ وہ ہر بل میرے ساتھ ہی تو ہوتی ہے۔ یہ طویل تنہائیاں اور یہ جگ راتے میں نے اُس سے باتیں کر کے ہی تو گزارے ہیں۔ ہمارا مسئلہ کبھی جسم کی قربت تو تھا نہیں..... مجھے یقین ہے کہ میری رُوح کی کی ہوئی باتیں اُس تک بھی ضرور پہنچتی ہوں گی.....“

میں اپنی بات ختم کر کے چپ ہو گیا۔ لاریب اور بڑی مالکن بھی بہت دیر تک اپنے لفظ جوڑنے کی کوشش کرتی رہیں اور پھر آخر کار میں نے ہی انہیں سہارا دیا۔ ”مجھے اُمید ہے کہ آپ کے سبھی سوالوں کے جواب میں نے دے دیئے ہیں۔ پھر بھی آپ کے دل میں اگر مزید کوئی خلش ہو تو

آپ پوچھ سکتی ہیں۔“ لاریب کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔“ نہیں..... مجھے اپنی زندگی میں اپنے کسی بھی سوال کے اتنے تسلی بخش جواب نہیں ملے..... آپ نے کوئی تشنگی چھوڑی ہی نہیں میرے واسطے..... لیکن کبھی کبھی اتنی سیرانی بھی ہم جیسوں کے لیے باعث شادی مرگ بن جاتی ہے..... میں شاید اسی وجہ سے اپنے الفاظ کھوپچکی ہوں.....“

ایسے میں بڑی مالکن نے لاریب کو سہارا دیا۔ حالانکہ مجھے نہ جانے کیوں محسوس ہوا کہ وہ کچھ دیر مزید خاموش رہنا چاہتی تھیں۔“ تم ایک مختلف نوجوان ہو عبداللہ..... تمہاری راہ بھی مختلف ہے لیکن آج تم نے اپنی راہ کی ہر سچائی کو جس طرح کھول کر بیان کیا ہے اس نے تمہاری قدر ہمارے دلوں میں فزوں تر کر دی ہے..... تم ہمیشہ اپنے اندر اتنی حیرتیں بیک وقت کیسے چھپائے پھرتے ہو۔“ اتنے میں خان صاحب کی بروقت آمد نے مجھے اس مشکل سوال کے جواب سے بچا لیا۔ وہ مصرعہ کہ رات بہت ڈھل چکی ہے لہذا آج رات میں یہیں حویلی کے مہمان خانے میں قیام کر لوں لیکن میں نے انہیں اصغر صاحب کی طبیعت کی مجبوری بتائی تو بادل خواستہ انہیں مجھے اجازت دینی ہی پڑی۔ بشیر اپنے تانگے سمیت ڈیوڑھی میں ہی موجود تھا کیوں کہ شاید اسے پہلے ہی وہاں لکے رہنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ میں اُن سب سے رخصت ہو کر تانگے میں بیٹھا تو لاریب تب بھی کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ مجھے الوداع کہتے وقت بھی اُس کی نظریں میرے چہرے پر جانے کیا ٹھول رہی تھیں۔ جیسے اُس کے اندر کوئی بات اُدھوری رہ گئی ہے۔

تانگہ پہاڑی کے پاس آ کر رُکا تو بشیر نے مجھے پیش کش کی کہ وہ میرے ساتھ درگاہ تک جانا چاہتا ہے کیونکہ سناٹا اور اندھیرا بہت گہرا تھا۔“ عبداللہ باؤ..... سنا ہے اس پہاڑی کے دوسری پار جنات رہتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ میں آپ کے ساتھ اُوپر تک آتا ہوں۔ آخر آپ ہمارے خاص مہمان ہو.....“

مجھے اس کی بات پر ہنسی آگئی۔“ کیوں تم کیا جنات کے داماد لگتے ہو جو وہ تمہیں کچھ نہیں کہتے..... اور پھر اُوپر پہنچنے کے بعد تمہیں بھی تو تنہا ہی نیچے آنا پڑے گا نا..... تو پھر تمہیں چھوڑنے کے لیے کون آئے گا؟..... اس طرح تو ہم ایک دوسرے کو ہی چھوڑنے کے لیے پہاڑی اُترتے چڑھتے رہیں گے اور اسی بھاگ دوڑ میں صبح ہو جائے گی.....“

بشیر ابھی میری بات سن کر ہنس پڑا۔“ واقعی..... اکیلے اُترتے ہوئے تو مجھے بھی ڈر لگے گا۔ چلو پھر اللہ بیلے.....“ بشیر نے تانگہ موڑا اور میں اس کی جلد بازی پر مسکراتا ہوا پہاڑی کی اُوپر جاتی پگ ڈنڈی پر چڑھنے لگا۔ رات واقعی بہت سرد اور تاریک تھی۔ ان پہاڑی علاقوں میں ایک پہاڑ پر اگر موسلا دھار بارش برس رہی ہو تو اگلی پہاڑی پر دھوپ چمک رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح رات کے وقت بھی دُور کسی پہاڑ پر بار بار بجلی چمک کر اُسے کیمرے کی فلش کی طرح نیلی روشنی کے جھماکوں سے منور کر رہی تھی جو اس بات کی غماری تھی کہ دوسرے پہاڑ کے جانب بارش برس رہی ہے۔ کبھی کبھی ہوا کے دوش پر بادلوں کے گر بننے کی آواز بھی کان میں پڑ جاتی تھی۔ میں لاریب کے سوالوں پر غور کرتا ہوا اُوپر چڑھا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں سردی کی شدت اور میرے تیز ہانپنے جیسے سانس کی وجہ سے میرے منہ سے بھاپ نکلنے لگی جیسے میں ہر سانس کے ساتھ سگریٹ کا بہت سا انگلا ہوا دھواں اُگل رہا ہوں۔ جیسے جیسے درگاہ قریب آتی جا رہی تھی ویسے ویسے کھرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک عقب میں ایک آہٹ سی ہوئی۔ میرے بڑھتے قدم رُک گئے اور میں نے پلٹ کر دیکھا لیکن پیچھے کوئی نہیں تھا۔ میں نے پھر قدم اٹھائے اور پھر وہی آہٹ ہوئی۔ میں پھر رُکا اور میں نے صاف محسوس کیا کہ کوئی میرے



ساتھ ہی رُک گیا ہے۔ لیکن کون.....؟ کیوں کہ وہاں تو دُور دور تک صرف اندھیرے کا راج تھا۔ میں نے پھر سر جھٹک کر چلنا شروع کیا اور اس بار مجھے اپنی دھوکہ جیسی چلتی سانس کے ساتھ کسی اور کے سانس لینے کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ دفعۃً بجلی کا دُور کہیں ایک اور جھماکا ہوا اور دائیں جانب والی چٹان کے اوپر مجھے کسی اکڑوں بیٹھے ہوئے شخص کا ہیولہ سادکھائی دیا جس کی سرخ انگارہ آنکھیں دُور چمکتی بجلی کی منعکس روشنی میں پل بھر کو چمکیں اور پھر دوبارہ گھٹا نوپ اندھیرا چھا گیا۔ میرے ماتھے سے پسینہ پھوٹا اور پل بھر میں میری کن پٹی سے ہوتا ہوا کان کے پیچھے سے لوٹک پہنچ گیا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا لیکن چٹان خالی پڑی تھی۔ وہ میرا واہمہ تھا، یاد وہی تھا؟ میں نے کچھ دیر وہیں رُک کر سانس بحال کی اور پھر لمبے لمبے دُک بھرتا ہوا درگاہ کے احاطے تک پہنچ گیا۔ اصغر صاحب کے کمرے کی لائٹیں جل رہی تھیں اور روشنی تلکے میٹھوں سے باہر صحن میں جھلک رہی تھی۔ میں نے پہلے آگے بڑھ جانے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ نہ جانے اتنی رات کو وہ کیوں بیدار ہیں، اُن کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اُن کی آواز اُبھری ”آ جاؤ عبداللہ میاں..... دروازہ کھلا ہے.....“ میں اندر داخل ہو گیا۔

”آپ ابھی تک سوئے نہیں.....؟..... اور آپ کو کیسے پتا چلا کہ باہر دروازے پر میں ہی ہوں۔“ وہ ہلکے سے مسکرائے ”یہاں اور کون آئے گا بھلا اس آدمی رات کے وقت؟..... وہ شیطان کا چیلہ تو اس احاطے میں آ نہیں سکتا کیونکہ بقول اُس کے یہاں مدفون نیک بزرگ کی وجہ سے اُس کی احاطے میں بندش ہے۔ لہذا میں نے سوچا تم ہی ہو سکتے ہو۔ کیسی رہی تمہاری دعوت؟“ بھئی یہ کریم خان صاحب کی حویلی والے تو تم پر بہت مہربان لگتے ہیں۔ ذرا دھیان رکھنا، کہیں تمہارے لیے کوئی بیڑیاں نہ تیار کر رکھی ہوں.....“

میں اُن کا اشارہ سمجھ کر ہنس دیا ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں..... وہ جانتے ہیں میں پہلے ہی اپنا آپ بندھوا کر یہاں تک پہنچا ہوں۔“ پھر میں نے انہیں راستے میں ہوئے ماجرے اور اُن جلتی انگارہ آنکھوں کا سارا حال بھی سنا ڈالا۔ اصغر صاحب میری بات سن کر بے حد متفکر ہو گئے۔ ”یہ ضرور وہی ہوگا..... لیکن وہ تمہارے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے.....؟“ عبداللہ میاں تمہیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے..... وہ بہت خطرناک مخلوق ہے.....“ میں نے کچھ سوچ کر کہا ”لیکن آپ نے اپنی پوری داستان مجھے سنائی ہے..... اس سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ خواہ مخواہ کسی کو نقصان پہنچاتا ہو۔ آپ سے بھی دوستی کے لیے اس نے پہلے آپ سے اجازت لی۔ خود کو آپ پر طاری کرنے کی کوشش نہیں کی..... اور پھر اگر اُسے مجھے نقصان ہی پہنچانا ہوتا تو وہ میرے جیل پور کے سفر کے دوران ٹرین میں میری بے خبری میں بھی مجھ پر وار کر کے مجھے پہنچا سکتا تھا۔ پھر اُس کے لیے اس قدر انتظار کیوں.....؟“

”ہاں..... یہی بات تو سمجھ نہیں آ رہی۔ بہر حال مجھے نہ جانے کیوں ایک دم ہی بہت فکر ہونے لگی ہے تمہاری۔“ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں محتاط رہوں گا لیکن نہ جانے کیوں میں خود اندر سے بہت بے چین تھا۔ میرے لبوں پر وہ سوال آئی گیا جو میں اصغر صاحب سے چاہتے ہوئے بھی نہیں پوچھ رہا تھا۔ ”لیکن آپ نے کیا یہ سوچا ہے کہ وہ آپ کو کس آگ میں جھونکنے جا رہا ہے۔ کسی انسان کا قتل معمولی بات تو نہیں..... پوری انسانیت کا قتل ہے..... کیا آپ یہ بھیانک جرم کر پائیں گے۔“ اصغر صاحب نے میری بات سن کر لمبا سا سانس لیا۔ ”ٹھیک کہتے ہو..... لیکن جب انسان خود ہر پل مر رہا ہو، اذیت سے اپنا آپ قتل ہوتا ہو محسوس کرتا ہو تو پھر ایسے میں ایسا ایک قتل اُسے بہت آسان لگنے لگتا ہے۔ میں یہ آخری جرم کرنے کے

بعد جس عذاب سے نجات پالوں گا اس کا اندازہ لگانا بھی محال ہے۔ مجھے اُس لامتناہی عذاب کے سلسلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے اس آخری عذاب سے گزرنا ہی ہوگا۔ کیونکہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں۔ یہی میرے معاہدے کی آخری شق اور آخری شرط ہے۔“

میں اصغر صاحب کو اسی سوچ میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ رات ڈھلنے ہی والی تھی۔ لہذا میں نے سونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور یونی بستر پر لیٹ کر کروٹیں لینے لگا اور پھر تبھی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا ”کہیں ایسا تو نہیں کہ چھلاوے کے اعتیاد رات اُس کی حد بھی مقرر ہو اور اُسے بھی اپنی کچھ خواہشات سرانجام دینے کے لیے کسی انسانی جسم کی ضرورت پڑتی ہو۔ تبھی وہ اصغر صاحب سے یہ قتل کروانا چاہتا ہے؟..... لیکن کس کا قتل.....“ اور پھر تبھی میرے ذہن میں اس جان لیوا خیال کا دوسرا جھماکا ہوا۔

”کہیں وہ مستقبل کا مجوزہ مقتول میں خود ہی تو نہیں.....؟..... اصغر صاحب کو کہیں وہ چھلاوہ میرے ہی قتل کا حکم تو نہیں دینے والا.....؟..... اور کیا پتا حکم دیا بھی جا چکا ہو اور اب صرف صحیح وقت پر عمل پیرا ہونا ہی باقی نہ رہ گیا ہو.....؟



ڈاٹ کام



## پھر وہی محبت

جانے وہ کیسا خیال تھا کہ اُس نے میرے ذہن میں کچھ یوں جڑ پکڑی کہ میں پھر دن چڑھے تک اُسی سوچ کے تانے بانوں میں الجھا رہا۔ کئی بار جی میں آیا کہ اس قدر جی جلانے کی کیا ضرورت ہے۔ سیدھے جا کر اصغر صاحب سے ہی پوچھ لینا چاہیے کہ اگر میں ہی اُس چھلاوے کا مرکز نظر ہوں تو پھر دیر کیسی؟..... لیکن نہ جانے کیوں ہر بار پوچھتے پوچھتے رُک جاتا۔ دو دن اسی ادھیڑ بن میں ہی گزر گئے۔ تیسرے دن اصغر صاحب صبح کی کوئی دھوپ سینکنے کے لیے انگوڑی کی بیلوں کے سامنے دریوں پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھے، میں دُور کھڑا پرندوں کو دانہ ڈالتے ہوئے کن اکھیوں سے انہیں دیکھ رہا تھا کہ انسان کو قسمت کیا کیا روپ بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میں نے زندگی میں قاتل تو بہت دیکھے تھے لیکن ایسا شخص کبھی نہیں دیکھا تھا جو اگلے چند روز میں قاتل بنے جا رہا ہو۔ اتنے میں نیچے گھاٹی میں بشیرے کے تانگے کا مخصوص بھونپو بجا۔ میں چونکا کیوں کہ آج نہ تو جمعرات تھی اور نہ ہی حویلی میں سے کسی کمین کے آنے کا کوئی امکان تھا۔ میں نے درگاہ کی دیوار سے نیچے دیکھا تو لاریب اپنے وجود کو بڑی سی کالی چادر میں لپیٹے تانگے سے اُترتی دکھائی دی۔ کرم دین حسب معمول اپنی بڑی سی ڈانگ سنبھالے اپنی چھوٹی بی بی کے آگے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ لاریب.....؟ آج.....؟ یہاں.....؟ اور اس طرح اچانک.....؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ وہ کچھ ہی دیر میں درگاہ کے احاطے تک پہنچ گئی اور اُس نے محن میں کھڑے کھڑے ہی دعا کر کے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور میری جانب چلی آئی۔ دھوپ اور اُونچائی پر چڑھنے کی وجہ سے اُس کا گلابی چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اُس کے ناک کا لوہنگ کسی سرخ یا قوت میں جزا کوئی نگ لگ رہا تھا۔ پسینے کی چندھنھی مٹھی سی بوندیں اُس کی روشن جبین پر موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں اور اُس کی سیاہ آنکھوں میں بیک وقت کچھ اُلجھن، کچھ بے چینی اور کچھ حیا کا عنصر دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ یہاں تک آ تو گئی ہے لیکن اپنے سارے لفظ نیچے گھاٹی میں چھوڑ آئی ہے۔ میں نے اُس کی مشکل آسان کر دی۔ ”کیوں لاریب بی بی..... کوئی سوال رہ گیا تھا کیا.....“

وہ بھی مسکرا دی۔ ”نہیں..... یہ تو میں نے اُسی دن بتا دیا تھا کہ آپ نے میرے سوالوں کی سرزمین کو کچھ ایسا سیراب کیا ہے کہ ہر تنگی مٹا دی ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں اُس رات کے بعد میں خود ایک سوال بنتی جا رہی ہوں۔ ایک عجیب سی کک، ایک اُن چاہی سی بے چینی ہے۔ میری رُوح مجھے کسی طرف تک کر بیٹھے نہیں دے رہی۔ ایسے لگتا ہے جیسے میرے جسم کے بچر میں پھر پھزار رہی ہے۔ اس کی اُڑان جانے کس سمت کی ہے۔ آج بہت بے چین ہوئی تو یہاں درگاہ پر تنہا ہی دعا کے لیے چلی آئی۔ امی کو میں نے خود اپنے ساتھ آنے سے منع کر دیا۔ ویسے بھی رات سے اُن کی طبیعت کچھ بھاری سی تھی، لیکن نہ جانے کیوں میں تنہا ہی یہاں آنا چاہتی تھی۔ حالانکہ خان جی کو میرا یوں کہیں تنہا آنا جانا پسند نہیں ہے۔ لیکن میں نے اُن سے بھی کسی طور اجازت لے لی۔ پر اب یہاں آ کر میں پھر اُسی شش و پنج میں ہوں کہ میں یہاں کھڑی کیا کر رہی ہوں.....؟ آپ ہی بتائیں میں کیا

کروں؟“ میں نے غور سے اُس کی جانب دیکھا وہ اپنی بات پوری کرتے کرتے ہاپنے لگ گئی تھی۔ جیسے اپنے اندر چلتی کش مکش کو جلد از جلد مجھ پر عیاں کرنا چاہتی ہو۔

”ایسا ہم سب کے ساتھ اکثر ہوتا ہے۔ یہ کوئی انہونی تو نہیں ہے۔ آپ نے ابھی اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنی آئندہ زندگی کے لیے کوئی راہ چنی ہے..... کبھی کبھی ہم سبھی اس درمیانی دور میں یہ خالی پن محسوس کرتے ہیں۔ منزل کا نشان ملنے تک ایسے دور زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ آپ کے اندر کی کھوج آپ کو بے چین رکھتی ہے اور بظاہر سامنے کوئی سنگ میل تک نظر نہ آنے کی وجہ سے ہم اُکتانے لگتے ہیں مجھے اُمید ہے کہ باقی سب کی طرح آپ کا بھی یہ دور عارضی اور چند روزہ ہوگا۔“ وہ کچھ دیر میری جانب دیکھتی رہی۔ ”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آپ حویلی جلد چکر لگائیے گا۔ خان جی اور امی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔“

وہ مجھ سے رخصت ہو کر پلٹ کر چل دی۔ اُس کے جانے کے بعد اصغر صاحب اُٹھ کر میری جانب آگئے۔ انہوں نے لاریب کو درگاہ کے احاطے سے نکلنے دیکھ کر کہا ”یہ کریم خان صاحب کی بیٹی تھی نا..... کیا کہہ رہی تھی۔“

”کچھ نہیں..... بس دعا مانگنے کے لیے آئی تھی۔“

اصغر صاحب نے میری جانب غور سے دیکھا ”کیا تم نے کچھ محسوس نہیں کیا، یا جان بوجھ کر انجان بننا چاہ رہے ہو۔“

میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا ”میں کچھ سمجھا نہیں..... میں نے کیا محسوس نہیں کیا.....؟“ اصغر صاحب نے لاریب کی راہ گزر پر یوں نظر ڈالی جیسے وہ ابھی تک درگاہ میں ہی موجود ہو، حالانکہ اُسے نکلے دیر ہو چکی تھی۔ ”یہ لڑکی تم سے محبت کرنے لگی ہے عبداللہ میاں..... حیرت ہے تمہیں اس بات کا اندازہ کیوں نہیں ہوا۔ حالانکہ کوئی اندھا بھی اس کی حالت دیکھ کر یہ سمجھ سکتا ہے کہ اُس کے دل میں تیر گڑھ چکا ہے..... تمہاری محبت کا اندھا تیر.....“

میں اصغر صاحب کی بات سن کر یوں ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا جیسے انہوں نے زبان سے بات نہیں، اپنی چٹاری سے کوئی سنپو لیا نکال کر میری جانب اُچھال دیا ہو۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے..... ایسا نہیں ہو سکتا..... وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔“

اصغر صاحب میری بات سن کر یوں مسکرائے جیسے کوئی کسی بچے کے منہ سے کوئی معصومانہ سی بات سن کر مسکراتا ہے۔ ”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے..... تم کسی اور سے محبت کرتے ہو، اس بات سے اُس کے دل میں جنم لینے والے کسی جذبے کا کیا تعلق ہے؟ یاد رکھو..... محبت ہم بے بس انسانوں کا کچھ اسی طرح پیچھا کرتی رہتی ہے جیسے کسی گھنے اندھیرے جنگل میں چلایا ہوا کسی ظالم شکاری کا اندھا تیر اپنی زد میں آئے ہوئے کسی معصوم غزال کا پیچھا کرتا ہے۔ بد قسمتی سے ہم بھولے بھالے انسان بھی اُسی سیدھ میں بھاگنے کی کوشش کرتے جس طرح وہ بڑی بڑی حیرت زدہ آنکھوں والا غزال بنا دائیں بائیں مڑے بس سیدھا ہی بھاگ اٹھتا ہے، لیکن تیر کی رفتار سے جیت نہیں پاتا اور آخر کار اپنی شرگ میں وہ تیز خنجر جیسا تیر پست کر داکرو ہیں کسی گہری کھائی میں گر کر دم توڑ دیتا ہے۔ مرنے سے کچھ لمحے پہلے خون کا آخری تیز فوارہ اُس کی شرگ سے چھوٹتا ہے اور وہ غزال اپنی رُوح نکلنے کی



تڑپ میں اپنے پیر پتھر ملی چٹان پر بے تابی سے رگڑتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح آج یہ لڑکی بھی اپنی ایڑھیاں رگڑنے اس پتھر ملی درگاہ پر آئی تھی۔ اُس کی شہرگ سے گرم خون کا آخری فورہ جاری ہو چکا ہے۔ اور اُس کی رُوح دھیرے دھیرے نکل رہی ہے۔۔۔۔۔ اب دیکھو کب۔۔۔۔۔

میں نے چلا کر اُن کی بات کا ٹ دی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔۔۔ وہ بہت معصوم ہے۔۔۔۔۔ میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ میری وجہ سے ایسی کوئی بھی اذیت کبھی بھی اُسے پہنچے۔۔۔۔۔ آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ وہ جان بوجھ کر اس آگ میں نہیں کود سکتی۔۔۔۔۔“

لیکن اصغر صاحب کا سفاک لہجہ اُسی طرح میری سماعت میں بر چھیاں گھونپتا رہا۔

”میں نے کہا نا، اس میں تمہارا، یا اُس معصوم لڑکی کا کوئی قصور نہیں۔۔۔۔۔ خطا وار تو صرف محبت ہے۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ وہی محبت کا اندھا تیر۔۔۔۔۔ جس کو چلانے والے ہاتھ اور کمان سے شست باندھنے والی آنکھ اس بے رحم تقدیر کی ہوتی ہے جس پر ہمارا اختیار بھی نہیں چلتا۔۔۔۔۔“

میں اب بھی اُلجھن میں تھا۔

”لیکن۔۔۔۔۔ لیکن آپ یہ سب اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں۔۔۔۔۔“

”کچھ باتیں جاننے کے لیے کسی خاص تجربے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن میں اس لیے بھی بُر یقین ہوں کہ پچھلے ایک سال میں میں نے چہرے پڑھنا خوب اچھی طرح سیکھا ہے۔ اس لڑکی کا چہرہ تو ویسے بھی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ تم شاید اپنی آنکھوں پر اس خاندان کے احترام کی بندھی پٹی کی وجہ سے اُس کا چہرہ پڑھ نہیں سکے، یا پھر تم نے شاید یہ سمجھ لیا ہے کہ چونکہ وہ تمہاری کہانی سے آگاہ ہے لہذا اُس کا دل تمہاری جانب مائل نہیں ہوگا۔ عبداللہ میاں۔۔۔۔۔ یہ لڑکیاں سن کی بالکل کچی گریاں ہوتی ہیں۔ ذرا سے دباؤ سے جتنے جانے والی اور پھر کبھی نہ جڑنے والی گریاں۔۔۔۔۔ اس لڑکی کا کوئل من بھی کہیں نہ کہیں سے جتنے گیا ہے۔۔۔۔۔ اب اس کے دل کی نازک اور کچی گرمی کو سوکھنے اور برباد ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔۔۔۔۔ وہ خود بھی نہیں۔۔۔۔۔“

اصغر صاحب میرے اوپر بجلیاں گرا کر واپس اندر اپنے کمرے کی جانب پلٹ گئے۔ لیکن مجھے نہ باہر کا چھوڑ گئے اور نہ ہی میں اپنے اندر چھپنے کی کوئی جگہ پارہا تھا۔ کاش انہوں نے جو کچھ بھی کہا وہ صرف اُن کا ایک اندازہ ہو اور ایسا کوئی بھی طوفان لا ریب کے اندر نہ پنپ رہا ہو۔ اُس کی ہنسی سے تو اُس کی حویلی ہی کیا پورا جبل پوری سدا روشن رہتا تھا۔ وہ اور اُس کی معصوم شرارتیں تو اُس کے ماں باپ کی سانسیں بڑھانے کا باعث تھیں۔ اپنی اس چھوٹی مالکن کی مسکراہٹ اور کلکاریاں ہی تو حویلی کے سبھی نوکروں کا خون بڑھاتی تھیں۔ ایسی زندہ لڑکی کو محبت کا منحوس گھن لگ جائے۔۔۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔۔۔ اس سے پہلے خود مجھے اپنا وجود لے کر یہاں سے کہیں دُور چلا جانا چاہیے۔ لیکن۔۔۔۔۔ میں جاؤں بھی تو کہاں۔۔۔۔۔ یہ سلطان بابا بھی مجھے یہاں بھیج کر جیسے بھول ہی گئے ہیں۔ میں نے اُسی شام ساحل والی درگاہ کے نئے عبداللہ یعنی نعمان کو ایک تفصیلی خط لکھ ڈالا کہ جیسے بھی ہو وہ سلطان بابا تک میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ میں اُن کا بے حد بے چینی سے یہاں جبل پور والی درگاہ پر انتظار کر رہا ہوں۔ میں وہ خط شام ہی کو نیچے گاؤں میں پوسٹ ماسٹر صاحب کے حوالے کر آیا کہ اُسے کل کی ڈاک میں ضرور نکال دیں۔ رات بھر اسی بے کلی میں بستر کی شکنیں بڑھاتا رہا لیکن اس سے کہیں زیادہ شکنیں میری منہ زور سوچ میرے ماتھے پر ڈالتی رہی۔

کہتے ہیں خدشے اور دوسو سے حد سے زیادہ بڑھ جائیں تو رفتہ رفتہ حقیقت کا روپ دھارنے لگ جاتے ہیں۔ اگلے دن خان صاحب نے

بشرے کے ہاتھ پیغام بھجوادیا کہ درگاہ کی سالانہ زکوٰۃ بٹائی کا وقت ہو چلا ہے لہذا میں سہ پہر تک آکر اُن سے سارے پیسے، مستحقین کی فہرست اور پتے اور تقسیم کا طریقہ کار وغیرہ جمع کرتا جاؤں تاکہ اگلے دن سے یہ کام شروع کیا جاسکے۔ میں سہ پہر کو وہاں پہنچا اور ہم شام پانچ بجے تک سارا طریقہ کار طے کر چکے تھے۔ خان صاحب کے کچھ مہمان بھی آگئے تھے لہذا میں اُن سے اجازت لے کر واپسی کے لیے باہر نکل آیا۔ بشرے کو میں نے تانگہ نکالنے کا کہا۔ آج میں مروانے میں خان صاحب کے ساتھ بیرونی ڈیوڑھی کے مہمان خانے میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ لہذا ایک بار جی میں آیا کہ کرم دین سے کھلو کر اندر بڑی مالکن کو سلام بھجوادوں۔ لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر میں نے خود کو روک لیا اور پلٹ کر تانگے کی طرف چل دیا۔ لیکن ابھی میرا ایک پاؤں تانگے کی پچھلی سیٹ کے پائیدان پر ہی تھا کہ لاریب نہایت غلت میں اندر سے نکل کر ہماری جانب آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اتنی بدحواس سی تھی کہ ٹھیک طرح سے میرے سلام کا جواب بھی نہیں دے پائی۔ ”آپ جا رہے ہیں.....؟ امی سے نہیں ملیں گے.....؟ میرا مطلب ہے یوں اچانک.....؟ میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ حویلی آئے ہیں تو سب سے مل کر جائیں گے.....“

”جی خان صاحب نے کچھ کام دیئے ہیں سو چاہئے اُن کو بچالوں تو پھر بڑی مالکن کی خدمت میں بھی سلام عرض کرنے آ جاؤں گا..... بہر حال آپ میری جانب سے انہیں آداب ضرور کہہ دیجئے گا۔“

وہ کچھ بے چین سی تھی۔ ”آپ پھر کب آئیں گے.....؟ میرا مطلب ہے مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں..... لیکن نہ جانے جب کبھی موقع ملتا ہے تو ذہن میں سب کچھ اٹھل پھٹل سا کیوں ہو جاتا ہے اور پھر آپ کے جانے کے بعد خود کو کوستی رہتی ہوں کہ آپ سے ٹھیک طرح بات کیوں نہیں کر پائی۔ اُس روز اتنی دُور چل کر درگاہ بھی آئی لیکن وہاں بھی بات اُدھوری ہی رہی.....“

لاریب جب بے چین سی، بار بار اپنے سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی اور اپنی نازک سی کلائی میں پڑا ہوا وہ سنہری کڑا بار بار گھما رہی تھی تو نہ جانے مجھے اس میں وہ پہلی ملاقات والی لاریب کہیں بھی جھلکتی نظر نہیں آئی۔ یہ تو کوئی اور لاریب تھی جس کی ہنسی کی جڑوں میں محبت کا دیمک اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔ اُس کی گلابی رنگت میں محبت کا نیلا زہر دھیرے دھیرے شامل ہوتا جا رہا تھا اور اُس کی نسوں میں بہتے سرخ خون میں عشق نامی زہریلے مادے کی سورج مکھی جیسی زرد رنگت کی ملاوٹ اب اُس لڑکی کے چہرے سے جھلکنے لگی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے ساتھ تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھا لوں اور اُسے شہوت کے درختوں والی اس جھرتا بہتی سڑک کے کسی پُرسکون کنارے لے جا کر اُس سے صرف اتنا کہوں کہ ”دیکھو..... یہ زندگی ہے..... یہ تم ہو..... اپنے اندر کی اس پُرشور بیتے جھرنے جیسی زندگی کو کسی بھی ایسے جذبے کے نام گروئی مت رکھ دینا کہ تمہارے اندر بہتی جیتی جاگتی زندگی کے سوتے ہی خشک ہو جائیں۔“ لیکن میں اُسے یہ سب کہہ نہ سکا اور میری زبان سے صرف اتنا ہی نکل سکا۔ ”آپ جب بھی چاہیں مجھے طلب کر سکتی ہیں۔ درگاہ اتنی دُور تو نہیں..... اور پھر میں کم از کم آپ سے ہمیشہ یہی توقع رکھتا ہوں کہ آپ اپنی کسی بھی ذہنی الجھن کو دل میں دبائے نہیں رکھیں گی..... اور جب بھی آپ کا من چاہے گا آپ اُسے بانٹ لیں گی..... یا ابھی تک آپ نے مجھے صرف مہمانوں کی فہرست میں ہی سہارا دکھا ہے.....؟“

میری بات سن کر اُس کے چہرے پر چھائے فکر کے بادل کچھ حد تک چھٹ گئے اور وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ مجھے یوں لگا جیسے کچھ دیر کے لیے



گھنٹی بدلیوں کی اوٹ سے سورج نے جھلک دکھلائی ہو۔“ نہیں..... مہمانوں کی فہرست سے تو میں کب کا آپ کو نکال چکی۔ آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔ کیا میری کبھی زہرا سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ جانے وہ کیسی ہوں گی.....؟ جن کی ایک جھلک نے ہی آپ کی زندگی بدل دی..... میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیا کوئی اپنے اندر ایسا اثر بھی رکھتا ہے کہ پل بھر میں کا یا پلٹ دے..... کیا آپ اُن سے مجھے ملوائیں گے.....“

مجھے اُس کے بھولے پن پر ہنسی آگئی۔ ”ضرور ملوائیں گا..... اور ایک بات یاد رکھیے گا کہ ہم میں سے ہر ایک کے مقدر میں ایسی ایک نظر ضرور ہوتی ہے جو ہماری کا یا پلٹ کر رکھ دے۔ اب یہ ہماری اپنی کوتاہ نظری ہے اگر ہم اپنے نصیب کی اس ایک نظر کو بھی برت نہ سکیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ خود ہماری اپنی نظر بھی کسی نہ کسی اور کے لیے ویسی ہی تاثیر رکھتی ہے۔ کون جانے ہم خود کس لمحے کس کی زندگی بدل رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں خود بھی اس کی خبر نہیں ہو پاتی..... شاید نظر کا یہ سارا کھیل ہی آنکھ مجھولی کا ہے۔“

وہ غور سے میری بات سنتی رہی۔ جانے وہ میرے لفظوں کے درپردہ معنی تک پہنچ سکی، یا نہیں لیکن اتنے میں اندر سے بڑی مالکن کا لاریب کے لیے بلاوا آ گیا۔ خود مجھے بھی اُس کا یوں اتنی دیر تک بیرونی ڈیوڑھی میں کھڑے رہنا کچھ بہتر نہیں لگ رہا تھا۔ وہ واپسی کے لیے پلٹنے سے قبل چند لمحوں کے لیے رُکی ”آپ ٹھیک کہتے ہیں..... لیکن یہ بھی ہماری بد نصیبی نہیں ہوتی کہ نظر کے اس پورے کھیل میں قدرت سارے کے سارے پتے اپنے پاس ہی رکھتی ہے..... اور خود ہم نظر کہنے، یا نظر ڈالنے والوں کی حیثیت صرف ایک تماشا کی کی سی ہوتی ہے..... نہ تو اپنے مقدر کی نظر کو برتنا ہمارے اپنے اختیار میں ہوتا ہے اور نہ ہی کسی اور کے نصیب میں لکھی ہماری اپنی نظر کو ہم روک سکتے ہیں..... ہمیں ہوش تب آتا ہے جب ہم اپنا سب کچھ لٹا چکے ہوتے ہیں، یا پھر خود کسی کے مقدر کے قزاق بن کر اُسے لوٹ لیتے ہیں..... آپ کے پاس پھر کبھی وقت ہوا تو ہم اس موضوع پر دوبارہ بات ضرور کریں گے.....“ وہ خدا حافظ کہہ کر پلٹ کر چل دی۔ بشرے نے بھی تانگلے کو اڑھ لگا دی اور دُور ہوتی حویلی کے اونچے برج بھی رفتہ رفتہ دُھندلے پڑنے لگے۔ لیکن مجھے اصغر صاحب کی کبھی باتیں یاد آئے لگیں۔ مجھے ان جذبوں کی طاقت سے ڈر لگنے لگا تھا۔ کیا یہ جذبے اتنے مزہ زور بھی ہو سکتے ہیں کہ ہمارے خون میں شامل ہو کر ہمارے اندر کو بھی تہس نہس کر دیں؟ ہمارے اندر کی طبعی حالت کو ہی بدل کر رکھ دیں؟ ہماری شخصیت کے رُخ پلٹ دیں؟ کیا ان جذبوں کی اپنی بھی کوئی کیمیائی تاثیر ہوتی ہے جو پل بھر میں ہمیں بخار میں پھنکا دیتی ہے اور سخت گرمی میں ہم سرد ہو کر لرزنے لگتے ہیں؟

اگلے دو دن اسی کش مکش میں گزر گئے۔ تیسرے دن صبح سویرے ڈاکے کی سائیکل کی مخصوص گھنٹی نیچے بجتی سنائی دی۔ مجھے خوشگوار سی حیرت ہوئی کیوں کہ ابھی دو دن پہلے ہی میں نے عبداللہ میاں کو تفصیلی خط لکھا تھا لیکن اس کا جواب دو ہفتے سے پہلے ملنے کی اُمید نہیں تھی کیوں کہ اس دُور دراز علاقے میں ڈاک کا نظام اس قدر تیز رفتار نہیں تھا کہ کوریئرسوں کی طرح دوسرے ہی دن ڈاک ملک کے کسی بھی کونے میں پہنچا دے۔ تو پھر یہ خط کس کا آیا ہوگا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاک بابو اوپر آ پہنچا۔ خط میرا ہی تھا اور مجھ سے پہلے والے عبداللہ کی جانب سے تھا۔ اُس نے اپنی اور سلطان بابا کی خیریت سے آگاہ کیا تھا اور میرے لیے خوش خبری یہ تھی کہ سلطان بابا کا کچھ دنوں میں جیل پورا آنے کا ارادہ تھا۔ مطلب یہ کہ میں نے نعمان کو خط لکھ کر جس خواہش کا اظہار کیا تھا قدرت نے ساحلی درگاہ پر میرا خط پہنچنے سے پہلے ہی وہ دعا قبول کر لی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ سلطان بابا کے آتے ہی اُن سے اجازت لے کر جیل پور سے کہیں آگے نکل جاؤں گا۔ اس سے پہلے کہ لاریب کے اندر کی بے چینی کوئی واضح رُخ اختیار کرے۔ مجھے اُس کی

نظروں سے اوجھل ہو جانا ہی بہتر لگ رہا تھا۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے زہرا بہت ٹوٹ کر یاد آئی اور مجھے لمبے سفر میں شدید تھکن کا احساس ہونے لگا۔ دراصل مجھے اب ڈر لگنے لگا تھا۔ سنٹرل جیل میں سکندر کی پھانسی سے لے کر یا قوط کے ہتھیار ڈالنے تک میں نے اس محبت نامی جذبے کی تباہ کاریاں خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں اور پھر میں تو خود اس منہ زور جذبے کی اندھی طاقت کا ایک چلتا پھرتا ثبوت تھا۔ لیکن میں اب یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور معصوم اس آتش جذبے کے تیزاب کی زد میں آکر اپنا آپ جھلسا ڈالے۔ لیکن بات اگر صرف ہمارے چاہنے اور نہ چاہنے کی ہی ہوتی تو پھر بات ہی کیا تھی۔ یہاں تو ہر فیصلہ پہلے ہی سے طے شدہ اور ایک لفافے میں مہر بند ہمیں ملتا تھا۔

اصغر صاحب اس روز صبح سویرے ہی اُنھ کر کہیں نکل چکے تھے۔ جب ڈاکے نے مجھے خط دیا تو اُس وقت میں درگاہ میں اکیلا ہی تھا۔ لیکن آج میں نے طے کیا تھا کہ اصغر صاحب کی واپسی پر اُن سے اُن کی اس ”پُر اسرار“ آوارہ گردی کا راز ضرور پوچھوں گا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ چھ ماہ اُن سے دن کی روشنی میں کم ہی ملتا ہے اور زیادہ تر وہ شام کے بعد ہی اُن پر واضح ہوتا ہے۔ لہذا اُن کی اس یا تر کا مقصد کچھ اور ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس روز وہ نہ جانے کہاں نکل گئے تھے کہ پہلے دو پہر اور پھر عصر کا وقت بھی گزر گیا لیکن اُن کی واپسی نہ ہوئی۔ عصر کے بعد آسمان پر اڑتے بادلوں نے گلے ملنا شروع کر دیا اور کچھ ہی لمحوں میں سب ہی کے درمیان سازش ہونے لگی کہ کس غریب کی کچی چھت پر برس کر اُسے ستایا جائے۔ بادلوں کے درمیان ہوتی سرگوشیاں آہستہ آہستہ بلند آواز بحث میں تبدیل ہونے لگیں اور اس گزر گڑبگٹ کی آواز نیچے ہم زمین والوں تک بھی پہنچنے لگی۔ موسم کے تیور کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے اور فی الحال اصغر صاحب کا دُور دور تک کچھ پتا نہیں تھا۔ ذرا سی دیر میں ہلکی ہلکی بوند باندی اور تیز ہوا کے جھکڑوں نے درگاہ کے صحن میں پڑے چوئ کی چادر کو اس طرح لہرانا شروع کیا جیسے کوئی کابلی پٹھان اپنی گٹھڑی میں سے رنگین کپڑوں کے تھان کھول کر نمائش کے لیے ہوا میں لہرا رہا ہو۔ میں نے درگاہ کی منڈیر سے نیچے گھاٹی میں جھانکا۔ گاؤں کی طرف سے آتی سڑک سنسان پڑی تھی۔ لیکن پھر دُور ہی سے کسی تانگے کے گھنگروں کی جھنکار سنائی دینے لگی اور کچھ لمحوں میں ہی سواری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ یہ بٹیرے کا تانگہ نہیں تھا۔ میں نے سنا تھا کہ گاؤں سے دُور پرے ایک اور بستی میں بھی چند تانگے سواریاں لاتے لے جاتے رہتے تھے یہ شاید اُن ہی میں سے کوئی ایک تانگا ہوگا۔ میں نے یہ سوچ کر اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس بھری کہ ضرور اصغر صاحب اسی تانگے میں آرہے ہوں گے۔ چلو اچھا ہے۔ شام ڈھلنے سے پہلے اور اندھیرا ہونے سے پہلے وہ اپنے ٹھکانے پر لوٹ آئے تھے۔ نہ جانے چند ہی دنوں میں اُن کے ساتھ کیسا عجیب سا رشتہ بن گیا تھا۔ حالانکہ وہ خود مجھے بتا چکے تھے کہ وہ کتنے خطرناک ارادے سے اس درگاہ پر قیام پذیر تھے لیکن پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے اُن سے کبھی بھی خوف محسوس نہیں ہوا حالانکہ اُن کے اس جان لیوا ارادے کا شکار میں خود بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن میرا اطمینان عارضی ہی ثابت ہوا۔ تانگے سے کوئی اور شخص اُتر اور پھر تانگے والے سے راہ پوچھ کر اوپر درگاہ کی پتھر پٹی ڈگر پر چڑھنے لگا۔ میں شش و پنج میں وہیں منڈیر پر کھڑے ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔ سرد ہوا کے تھپڑے اپنے ساتھ ٹھنڈی برجیوں جیسی بوندوں کی سوغات لیے اُس کا استقبال کرنے کے لیے لپکے چلے آرہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ اُپر پہنچ گیا۔ اُس نے دُور ہی سے مجھے سلام کیا اور قریب آکر بولا۔

”جناب میرا نام حوالدار اکرم ہے۔ جیل پور پولیس تھانہ کا محرر بھی میں ہی ہوں۔“



”جی فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ مجھے الجھن سی ہو رہی تھی۔ پولیس کا اس درگاہ پر بھلا کیا کام؟ اس نے اپنی بیلٹ کسی۔

”آپ کا نام ہی عبداللہ ہے۔“

”جی..... میں عبداللہ ہوں۔“

”آپ کو میرے ساتھ ذرا تھانے تک چلنا ہوگا، نیچے کوئی خون ہو گیا ہے۔“

خون.....؟؟ اچانک ہی مجھے یوں لگنے لگا جیسے ساری درگاہ ہی گھوم رہی ہو۔ اچانک ہی مجھے امنصر صاحب کی لمبی غیر حاضری اور اُن کے

آخری جرم کے ارتکاب کے خیال نے آگھیرا۔

کہیں چھلاوے کا آخری حکم حقیقت کا روپ تو نہیں دھار چکا تھا۔

پاک سوسائٹی

ڈاٹ کام

## پہلی رہائی

میں نے گھبرا کر حوالدار سے پوچھا ”خون..... لیکن کس کا.....؟ اور آپ کو میرے پاس کس نے بھیجا ہے۔“ ”جانتے نہیں جناب.....“ تھانے دار صاحب نے بھیجا ہے۔ جبل پور سے پچھلے اسٹیشن پر ایک لاش ملی ہے کسی پکی عمر کے شخص کی۔ یہاں گاؤں میں تو کوئی شناخت نہیں کر پایا تو تھانے دار نے یہاں بھجوا دیا کہ آپ کو بھی بلا لاؤں..... شاید آپ کی شناخت کا ہو وہ بندہ.....؟“

پکی عمر کے شخص کی لاش..... یا میرے خدا..... میں نے جلدی سے اپنے کمرے میں پڑی اپنی مثال اپنے کاندھوں پر ڈالی اور حوالدار کے ساتھ چل پڑا۔ سارے راستے میرے ذہن دل میں عجیب عجیب سے دسوے جنم لیتے رہے اور میں خدا سے اپنے خدشات کو حقیقت میں نہ بدلنے کی التجا کرتا رہا۔ ہم جبل پور گاؤں کے باہر ہی سے آگے بڑھ گئے۔ جبل پور سے پہلے قادر پور کاریلوے اسٹیشن آتا تھا جو جبل پور سے صرف چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ آدھے راستے میں ہی موسلا دھار بارش نے ہمیں آگھیرا اور ہم نیم پختہ سڑک پر دوڑتے اور کچھڑ کے چھینے اڑاتے تاکنگ کی کچھلی نشست پر بیٹھے بارش کی بو بھٹاڑ سہتے ہوئے جب اسٹیشن پر پہنچے تو مغرب کا اندھیرا اچھا چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر پریئر و میکس کے بڑے بڑے لیپ روشن کر دیئے گئے تھے جن کی پہلی روشنی میں برستی بارش کے قطرے یوں محسوس ہو رہے تھے جیسے آتش بازی والے کسی انار کو اندھیرے میں چلانے کے بعد اُس میں سے چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔

ایک جانب کچھ پولیس والوں اور گاؤں کے چند بڑے بوڑھوں کا ہجوم سالگا ہوا تھا۔ پولیس والے لمبے لمبے خاکی گرم اور کوٹوں میں ملبوس تھے اور ایک سپاہی کسی افسر کے لیے چھتری تانے کھڑا تھا۔ شاید یہی قادر پور کا تھانے دار تھا۔ ہم دونوں بھی اُسی کی جانب بڑھ گئے۔ ہمیں اپنی جانب آتے دیکھ کر بھیڑیوں چھٹی جیسے چیونٹیوں کا کوئی جم گھٹا پانی کی تیز لہر اپنے درمیان سے گزرتے پا کر چاروں جانب چھٹ جاتا ہے۔ نیچے پلیٹ فارم کی زمین پر کسی لاش پر کپڑا ڈال کر اُس کا بدن چھپا دیا گیا تھا۔ چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔ تھانے دار نے مجھ سے ہاتھ ملایا ”تو تم ہو جبل پور کی درگاہ کے نئے مجاور..... لیکن تم تو کافی کم عمر ہو.....؟.....“ خان صاحب سے ایک بار تمہارا ذکر سنا تھا۔ اس برستے موسم میں تمہیں اس لیے زحمت دی ہے کہ آج صبح منہ اندھیرے یہاں ایک لاش ملی ہے۔ زخم گہرا ہے اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ کوئی ڈکیتی کی واردات ہے۔ ڈاکو اسے لوٹنے کی نیت سے آیا ہوگا اور مزاحمت پر چہرہ اٹھوپ کر مال لوٹ کر لے گیا۔ لیکن اس شخص کی شناخت مشکل ہوگئی ہے۔ یہاں لوگ ایک دوسرے کو تین چار نسلوں سے جانتے ہیں لہذا یہ بات تو پکی ہے کہ متقول اس علاقے کا نہیں ہے۔ ہم نے شیخ نامہ تو کر لیا ہے لیکن لاش اٹھانے سے پہلے سوچا کہ ایک بار تم سے بھی شناخت کروالیں کیونکہ بہت سے لوگ درگاہ کی زیارت کے لیے دور دراز علاقوں سے بھی آتے ہیں جو سیدھے درگاہ جاتے ہیں منت مانگتے ہیں اور پھر دوسری گاڑی پکڑ کر واپس اپنے علاقے کو پلٹ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تم نے اسے پہلے درگاہ پر دیکھا ہو..... اس کا باقی سامان تو لوٹ لیا گیا ہے



صرف اس کے پاس یہ پھولوں کے چند ہار ملے ہیں۔ میں نے تھانے دار کے ہاتھ کے اشارے کی جانب نظر ڈالی تو چند کلائے باسی پھولوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر پلیٹ فارم پر لگی لکڑی کے بیچ کے پاس پڑا ہوا تھا۔ جانے کیوں میرے اندر ایک لمحے کے ہزار دیں جیسے میں کچھ جھمن سے ٹوٹ سا گیا۔ جانے وہ بد قسمت پھول کس کی لحد پر پھنسنے کی قسمت لے کر چلے تھے۔ کیا خریدنے والے کو یہ پتا تھا کہ یہ پھولوں کی چادر آخر کار اسی کا نصیب ہوگی؟ لیکن پتا نہیں کیوں میں لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹانے میں شدید ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ تھانے دار نے میری مشکل آسان کر دی اور حوالدار کو اشارہ کیا جس نے آگے بڑھ کر چادر کھینچ لی۔ میں نے پلکیں موندھ لیں اور پھر ایک گہری سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔ مرنے والا واقعی درگاہ کا ایک پرانا نازاری تھا اور میں نے بھی ایک آدھ جمعرت کو اُسے وہاں آتے دیکھا تھا۔ میں نے سر ہلا کر تھانے دار کو تصدیق کر دی اور اپنا بیان بھی ریکارڈ کروا دیا۔ اس شخص نے درگاہ پر چندہ بھی دیا تھا اور اس کا نام پتہ درگاہ کے رجسٹر میں درج تھا۔ تھانے دار نے حوالدار کو دوبارہ میرے ساتھ درگاہ تک جانے کا کہا اور ہاتھ ملا کر میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے درخواست کی کہ اگر مجھے قتل کے بارے میں مزید کوئی بات پتا چلے تو نام اور پتے کے ساتھ وہ تفصیل بھی ایک کاغذ پر درج کر کے حوالدار کے حوالے کر دوں۔ میں اور حوالدار جب دوبارہ درگاہ پہنچے تو رات پوری طرح شام کی گردن میں اپنے تاریک پنجے گاڑھ چکی تھی۔ اندھیرے میں پہاڑی پگ ڈنڈی پر چلتے ہوئے پھر سے وہی کسی نادیدہ ہستی کے اپنے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا احساس ہوا۔ لیکن میں حوالدار کی وجہ سے سر جھٹک کر اوپر چڑھتا گیا۔ درگاہ کے احاطے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری نظر اصغر صاحب کے کمرے کی جانب اٹھی۔ اُن کے کمرے کی لائٹیں جل رہی تھیں۔ میں نے حوالدار کو تمام تفصیلات ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیں اور اُسے زخمت کر کے فوراً اصغر صاحب کے کمرے کی جانب پکا۔

اصغر صاحب کافی نڈھال سے لگ رہے تھے۔ جیسے دن بھر کافی مشقت کاٹی ہو، انہوں نے۔ میں نے اُن سے شکایت کی ”کہاں چلے گئے تھے آپ یوں بناتائے؟“۔۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں میں کس قدر پریشان ہو گیا تھا۔۔۔۔۔“

اصغر صاحب مسکرائے ”معاف کرنا عبداللہ۔۔۔۔۔ بس اچانک کام ہی کچھ ایسا پڑ گیا تھا۔ اس لیے بناتائے صبح سویرے مجھے نکلنا پڑ گیا۔۔۔۔۔ میں نے اتنی صبح تمہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”لیکن آپ گئے کہاں تھے۔“

اصغر صاحب نے بے دھیانی میں جواب دیا۔ ”کہیں نہیں۔۔۔۔۔ جبل پور سے آگے ایک اور اسٹیشن ہے۔۔۔۔۔ قادر پور۔۔۔۔۔ بس وہیں تک گیا تھا کسی شخص سے ملنا تھا پر وہ ملا نہیں۔۔۔۔۔“

میں قادر پور کا نام سن کر زور سے چونکا۔ میرے چہرے کے بدلتے تاثرات اصغر صاحب نے بھی محسوس کر لیے۔ ”کیوں کیا ہوا۔۔۔۔۔ تم اتنے حیران اور ایک دم ہی پریشان کیوں ہو گئے ہو۔۔۔۔۔؟ سب خیر تو ہے نا۔۔۔۔۔“

میں نے مشکوک نظروں سے اُن کی جانب دیکھا۔ وہ صبح منہ اندھیرے قادر پور کے لیے نکلے تھے اور صبح سویرے ہی قادر پور کے ریلوے پلیٹ فارم پر ایک قتل ہو گیا۔۔۔۔۔ کہیں یہ قتل۔۔۔۔۔ اس سے آگے میں کچھ سوچ نہیں سکا۔ اصغر صاحب نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ”کیا ہوا۔۔۔۔۔؟ بولتے کیوں نہیں۔۔۔۔۔؟“

میں نے انہیں شام کی ساری داستان، حوالدار کے آنے سے لے کر میرے قادر پور جانے اور لاش کی شناخت تک کے تمام مراحل سنا دیے۔ وہ بھی حیران رہ گئے۔

”اوہ..... یہ تو واقعی بڑے افسوس کی بات ہے..... جانے وہ بے چارہ کون تھا.....“ وہ بولتے بولتے اچانک چپ سے ہو گئے۔ ”مظہر..... کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ یہ خون میں نے کیا ہے.....؟..... یقیناً مانو اس جرم میں میرا کوئی عمل دخل نہیں..... میں تو اسٹیشن کی طرف گیا بھی نہیں.....“ مجھے اُن کے لہجے میں سچائی کی جھلک محسوس ہوئی۔ ویسے بھی آج تک انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ پتا نہیں کیسے ٹھیک اُسی وقت میرے دل میں بہت دنوں کی چھپی بات میرے لبوں پر آگئی۔ ”کیا آپ کو چھلاوے نے اُس شخص کا نام نہیں بتایا جس کو وہ آپ کے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا ہے..... کہیں وہ میں تو نہیں.....؟“

اب اچھلنے کی باری اصغر صاحب کی تھی ”کیا.....؟..... نہیں نہیں..... باخدا ایسا کچھ نہیں..... ویسے تو اُس نے مجھے اُس شخص کا نام نہیں بتایا۔ لیکن وہ جو کوئی بھی ہے اُس کا خاتمہ مجھے درگاہ سے باہر کسی مقام پر کرنا ہوگا۔ اُس کا ٹھکانہ یہ درگاہ نہیں ہوگی..... اور یقیناً کرو کہ اگر مجھے یہ پتا چلتا کہ مجھے اپنی آزادی کے لیے تمہاری جان لینی ہوگی تو میں اُسی بل خود اپنی جان لے لیتا۔ میں بہت بڑا گناہ گار صحیح..... لیکن کچھ گناہ.....“ میں نے انہیں تسلی دی۔ ”آپ دل پر نہ لیں میرا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا، اگر کبھی میری اس لا حاصل زندگی سے آپ کی آزادی حاصل ہوتی نظر آتی تو آپ کو کہنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔“

انہوں نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ”میں جانتا ہوں..... لیکن تم فکر نہ کرو..... میری آزادی میں اب کم وقت رہ گیا ہے..... میں نے بہت عذاب ناک قید کاٹ لی..... اب بیڑیاں کھلنے کا وقت قریب ہے۔“

جانے اُس لمحے میں چاہے کبھی اُن سے یہ کیوں نہیں کہہ سکا کہ کسی کے خون کے بدلے جینیں گئی آزادی بھلا انہیں کیا آزاد کر پائے گی؟ مجھے یوں لگا وہ ایک قید سے نکل کر کسی دوسرے اور بڑے زمانہ میں داخلے کی تیاری کر رہے ہوں۔

ساری رات ان ہی سوچوں میں گزر گئی۔ صبح میں نے اپنے کمرے سے نکل کر دیکھا تو رات بھر بیٹھ چھا جوں برسا تھا اور اس وقت بھی موسلا دھار بارش جاری تھی۔ اوپر والی پہاڑی کی چوٹی سے بارش کا پانی بہت سے پرتالوں کی صورت میں نشیب کی جانب بہہ رہا تھا اور فضا میں صرف اس بہتے پانی کا ہی شور مچایا تھا۔ شاید دنیا کی بہترین موسیقی اسی شفاف پانی کے بہنے کی آواز میں کہیں مضمر ہوتی ہے۔ میں کچھ دیر وہیں صحن میں کھڑا پانی کی باتیں سناتا رہا۔ جو مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ دنیا میں سب کچھ خراب ہونے کے باوجود اب بھی کچھ ایسی چیزیں ہیں جو قدرت نے ہمارے لیے بچا کر رکھی ہیں۔ یہ آسمان، یہ بادل، یہ راستے، یہ ہوا..... اور یہ برقی بارش کی بوندیں..... بہت کچھ باقی ہے ابھی یہ بے زار جیون جتانے کے لیے.....

درگاہ کے کچے صحن میں بارش کا پانی جمع ہونے لگا تھا۔ میں نے پاس رکھی ایک پرانی اخبار کی کشتی بنائی اور اس پانی میں چھوڑ دی۔ ایک بل میں ہی میں اپنے بچپن کے بارش کے پانی اور کاغذ کی کشتی کے کھیل کی یاد میں ایسا کھویا کہ تیز بارش کی بوندوں نے میرا وہ کاغذی سفینہ کب بھگو کر ڈبو دیا، مجھے اس کی بھی خبر نہ ہوئی۔ باہر کسی آہٹ کی آواز نے جب تک مجھے چونکا یا تب تک میری کشتی پوری طرح بھگ کر کھل چکی تھی اور اب پانی میں